احتسابِ فکر و نظر

مصنف

ڈاکٹر مشتاق احمد

احتسابِ فکر و نظر

مصنف

ڈاکٹر مشتاق احمد

پرنسپل، ملّت کالج، دربھنگہ (بہار)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

نے کسی خاص طبقے یا خطے کی زندگی میں ہی انقلاب برپا نہیں کیا بلکہ ایک عہد کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ سرسید احمد جیسے ایک عظیم مصلح ومفکر کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی و فکری کارناموں پر اس مختصر مقالے میں تفصیلی گفتگو ممکن نہیں لیکن اس حقیقت کے نقوش تو ابھارے ہی جا سکتے ہیں کہ سرسید احمد کے فکری سرمایے میں وہ قوت آج بھی ہے جس کے سہارے نہ صرف ہم اپنی سوچ کے دائرے کو وسیع کر سکتے ہیں بلکہ اس عہدِ حاضر یعنی گلوبلائزیشن کے ہر چیلنج کا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں۔

ہم اس حقیقتِ ابدی وازلی سے بخوبی واقف ہیں کہ ہر دانشور، مصلح اور مفکر اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور عمرانی فلسفہ کی قبولِ عام سچائی ہے کہ ہر عہد بے شمار مسائل، رجحانات، تحریکات اور اصلاحات کا حامل ہوتا ہے۔ ہر شخص کی نگاہ ان تغیراتِ زمانہ تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی۔ ان تبدیلیوں کو ایک بیدار اور حساس انسان ہی محسوس کر سکتا ہے جیسا کہ تین (*Tain*) نے اپنی کتاب ''*Philosophy of Art*'' میں لکھا ہے کہ:

> ''فن کوئی ایسی شئے نہیں جو اپنے ماحول سے منقطع اور بے نیاز ہو۔ لہٰذا اسے سمجھنے کے لئے ہمیں اس عہد کے ذہنی اور معاشرتی حالات ومحرکات کا لازمی طور پر مطالعہ کرنا ہوگا جو اس کی تخلیق کا باعث ہوئی''۔

سرسید اپنے عہد کے نبض شناس تھے۔ انہوں نے گہری نظر سے اس وقت کے ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات کا جائزہ لیا تھا۔ چوں کہ ان کا دردمند دل حب الوطنی کے جذبے سے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس لئے وہ اپنے معاشرے کا علاج ایک طبیب کی طرح کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت جو سیاسی حالات تھے اس نازک وقت میں سرسید کوئی بڑی سیاسی تحریک نہیں چلا سکتے تھے کیوں کہ ایک

الرحمٰن کے ارتقائے فکر ونظر کی غماز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے

دھیرے دھیرے میری آنکھیں ہوگئیں صحرا نشیں
قطرہ قطرہ کوئی ان جھیلوں کا آنسو لے گیا

☆

اس کا دل داغ ہے اندر سے بھنور ہوں میں بھی
اپنے ہی چاند کے سائے کا سفر ہوں میں بھی

☆

رات بیمار سی ہے صبح عیادت جیسی
تو نہیں ہے تو ہر اک رُت ہے مصیبت جیسی

☆

آنکھ روتی ہوئی ہنستا ہوا چہرہ کیا ہے
کچھ بتا صفحۂ دریا پہ یہ لکھا کیا ہے

☆

دفترِ زیست میں ایسے بھی کئی نام ملے
جو فسانہ نہ بنے صرف حوالوں میں رہے

☆

ہم گلستاں میں رہے بوئے محبت بن کر
گرچہ آوارہ و برباد پریشاں بھی رہے

طوالت کے خوف سے مزید غزلیہ اشعار کی یہاں گنجائش نہیں اور نہ ان کی نثری نظموں کی مثالیں ممکن ہیں لیکن بطورِ نمونہ ان کی دو نثری نظمیں یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ نثری نظموں میں بھی لطف الرحمٰن نے اپنی فنکاری کو معراج بخشا

ہے۔ نظم ''تو اریخ'' ملاحظہ کیجئے

پہاڑوں کی ناہموار سڑکوں کی طرح
وہ بھی بے سمت و بے جہت
شخصیت رکھتی ہے
وادیوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے
آوارہ گرد بگولوں کی طرح
کبھی کسی جھاڑی سے اٹھکھیلیاں کرتی ہے
کہیں نیچے سے اوپر
اور کبھی اوپر سے نیچے
لہریں لیتی رہتی ہے
''آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی!''
''آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی''
''سنگ راہ سے بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی''
اور جب صحراؤں سے گذرتی ہے تو
ہلکان ہو جاتی ہے
اور میدانوں میں پہونچتی ہے
تو یوں پھیل جاتی ہے کہ
اس کا وجود ہی معدوم ہو جاتا ہے
اپنے کناروں سے محروم ہو جاتی ہے
اور کبھی جب جوش میں آتی ہے
تو بستیوں اور شہروں کو

بے وجود بنا دیتی ہے
اور پھر آہستہ سے
سمندر کی گود میں اتر کر
ایک بے نام سی لہر بن جاتی ہیں
اور اس کے کھارے پانی میں
اپنی ساری مٹھاس کھو دیتی ہے
(راگ براگ۔ ص:۱۰۲۔۱۰۳)

اور ''صنم آشنا'' کی نظم ''عکس'' ملاحظہ کیجئے

میرا سلسلۂ نسب
نہ چاند سے ملتا ہے
نہ کسی ستارے سے
میرے محبوب!
میں تو!
تیری مہربان نگاہوں کا عکس ہوں
جس نے
سورج کو بھی
مجھ سے شرمندہ کر دیا ہے (صنم آشنا۔ص:۹۶)

پروفیسر وہاب اشرفی نے بجا لکھا ہے کہ :

''ان کی تنقیدی کاوشوں میں ان کے گہرے علمی شعور کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے ۔ ان کے مفکرانہ ذہن کی شناخت کے کئی پہلو ابھرتے رہتے ہیں۔ایک دانشور جب شاعری کے میدان میں

قدم رکھتا ہے تو اس کی فکر کی صلاحیت کا اندازہ اس کے شعر سے بھی ہونے لگتا ہے"۔(وہاب اشرفی، راگ براگ ص:۱۵۸)

بلاشبہ ان کی غزلیں اور نظمیں ان کے زرخیز مفکرانہ ذہن اور صالح فکر ونظر کی آئینہ دار ہیں۔لیکن شرط یہ ہے کہ لطف الرحمٰن کی شاعری کو پڑھنے کے لئے تمام تر تعصب سے پاک ذہن کی ضرورت ہے اور قاری کا باشعور ہونا بھی لازمی ہے۔جیسا کہ شفیع جاوید نے کہا ہے:

"لطف الرحمٰن کے اشعار ذہنی بالیدگی اور ارتفاع کے اظہار ہیں۔ یہ شاعر دلنواز عام ادبی حافظے کی شئے نہیں ہے کیوں کہ انہیں غزل کی فہم کے ساتھ ہی پڑھا جاسکتا ہے"۔

(شفیع جاوید۔دشت میں خیمۂ گل،۲۰۱۲ء۔ص:۱۷)

لطف الرحمٰن اردو تنقید نگاری میں بھی اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنی تحریروں کو پیش پاافتادہ مضامین کا پلندہ نہیں بنایا ہے بلکہ صحرائے نقد میں اپنے تعمیری فکر کی بارشوں سے دلکش سبزہ بھی اگائے ہیں۔وہ تنقید کو بھی تخلیق سے کمتر نہیں سمجھتے اور ادب کے لئے تنقید کو سائنس تصور کرتے ہیں۔واضح ہو کہ ان کا پہلا تنقیدی کارنامہ"جدیدیت کی جمالیات"(۱۹۹۳ء) میں شائع ہوا تھا اور اس وقت یہ کہا جارہا تھا کہ جدیدیت کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو چکا ہے لیکن لطف الرحمٰن کی یہ کتاب گہرے جھیل میں ایک کنکر پھینکنے کی مانند تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے جھیل کے کنارے تک شعورِ آب کے ہلکوروں نے غوروفکر کے کتنے دائرے بنادئے تھے اور جہانِ ادب میں ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ان کی نگاہ میں تنقید مکھی پر مکھی مارنے کا عمل نہیں تھا بلکہ وہ تنقید میں بھی فکری اور جمالیاتی مفاہمت کو لازمی قرار دیتے تھے۔تنقید کے متعلق ان کا نظریہ واضح تھا کہ:

''ادب اور تنقید میں چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن فنی تنقید کی سرحدوں کا آغاز تخلیق کی تکمیل کے بعد ہوتا ہے۔تنقید کا بنیادی مقصد فنکار اور قاری کے درمیان سازگار فکری اور جمالیاتی مفاہمت اور جذبہ واحساس کی ہم رشتگی کا فروغ ہے۔نقاد قاضی، مفتی یا فقیہہ نہیں ہوتا کسی حد تک مدرس ہوسکتا ہے۔نقادوں پر قارئین کے ذوقِ ادب وفن اور احساسِ جمال کی تہذیب وتحسین کی ذمہ داری تو یقیناً عائد ہوتی ہے۔(نقدِ نگاہ۔ص:۱۱)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

''تنقید انسانی جبلت ہے۔ انسان کا کوئی عمل تنقیدی احساس وشعور سے بے نیاز و بے تعلق نہیں ہوتا...... تخلیقِ ادب انسانی وجود کا سب سے گراں قدر اور اعلیٰ ترین عمل ہے۔ادب تجربۂ حیات کی آئینہ داری نہیں بلکہ اس کی تخلیقِ نو ہے۔ادب روحانی بصیرتوں اور انسانی زندگی کے درمیان ایک رابطے کا نام ہے۔ شاعراندیکھی دنیاؤں کا پروہت ہوتا ہے۔ وہ ایک مقدس تخلیق کار ہوتا ہے جو تفنن طبع کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا حسن کار ہوتا ہے جو اپنے سماج اور معاشرے میں مختلف سطحوں پر انسانی آرزومندیوں کی تشریح وتوضیح کرتا ہے۔ وہ سماجی صحت، تہذیبی نفاست، مساوات واخوت اور آزادی ضمیر کا نگہبان ہوتا ہے''

(مقدمہ''نقدِ نگاہ''،۲۰۰۶ء۔ص:۹)

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ لطف الرحمٰن شروع کے دنوں میں چھپنے چھپانے میں دلچسپی رکھتے تھے لیکن دو دہائیوں تک انہوں نے چھپنے چھپانے سے زیادہ

مطالعے کو ضروری سمجھا اور شاعری ہو کہ نثری تخلیقات اس کی روح میں اترنے کی کوشش کی۔یہی وجہ ہے کہ ''جدیدیت کی جمالیات'' (۱۹۹۳ء) کی اشاعت کے بعد ان کی دوسری تنقیدی تصانیف ''نثر کی شعریات'' (۲۰۰۶ء) ''نقدِ نگاہ'' (۲۰۰۶ء) ''تنقیدی مکالمے'' (۲۰۰۸ء) ''تعبیر وتقدیر'' (۲۰۰۸ء) ''فنونِ لطیفہ اور تخلیقی تخیل'' (۲۰۱۱ء)، ''تنقید وتخلیق'' (۲۰۱۱ء) میں بالترتیب شائع ہوئیں۔اس سے پہلے ان کی پی ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ ''راسخ عظیم آبادی کی غزل گوئی'' کتابی صورت میں اور ہندی شاعر ''بہاری'' پر ایک مونوگراف بھی ساہتیہ اکادمی سے ہی شائع ہوا تھا۔

پروفیسر لطف الرحمٰن تنقید کو بھی تخلیق کے درجہ کی چیز سمجھتے تھے اور ان کا یہ اصرار تھا کہ تخلیق سے کسی قدر تنقید کی اہمیت کم نہیں ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ نقاد اپنی تنقیدی آرا میں اوریجنلیٹی (Orignality) برقرار رکھے نہ کہ ''مانگے کا اجالا'' سے کام چلائے۔انہوں نے بارہا اس فکرمندی کا اظہار کیا کہ اردو میں جو تنقید لکھی جارہی ہے وہ زیادہ تر مانگے کا اجالا ہے۔انہوں نے اردو تنقید کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''کسی بھی تخلیق کی مکمل معنویت اور تعبیر وتفسیر کبھی مکمل نہیں ہوتی، بدلتے ہوئے عصری وآفاقی منظر وپس منظر میں تخلیق فن کی معنویت میں بھی تبدیلی وتغیر ایک فطری امر ہے، نقاد فن کی مسلسل معنی آفرینی کا سب سے اہم فریضہ ادا کرتا ہے، فن کو از کاررفتہ، مہمل، بے معنی اور باسی پن اور کہنگی سے محفوظ رکھتا ہے، یہ اس کا اہم کارنامہ ہے، جو اس کے فن کے وجود کو ایک ناگزیر حصہ بنادیتا ہے، تخلیق وتنقید ایک ہی سکّے کے دورخ ہیں۔یعنی ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم یعنی نقادانِ طلسمات سے پردہ اٹھاتا ہے،

جوتخلیق کے گرد حائل ہیں''۔

(مقدمہ تنقید وتخلیق۔۲۰۱۱،ص:۱۰)

یہی وجہ ہے کہ وہ اردو ادب کے قد آور ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی بصیرت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔اگرچہ ان دونوں نامورانِ ادب سے ان کے کبھی نہ کبھی اچھے روابط رہے۔کیوں کہ انہوں نے اپنی کتابوں کا انتساب ان دونوں نامورانِ ادب کے نام کیا ہے۔مگر وہ کسی مصلحت پسندی پرحق گوئی کوفوقیت دیتے تھے اس لئے انہوں نے ان شخصیات پر بھی تبصرہ کرنے سے گریز نہیں کیا۔یہ اور بات ہے کہ پروفیسر لطف الرحمٰن کی ان دونوں شخصیات کے تعلق سے لکھی گئی تحریروں سے اتفاق کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن انہوں نے جو کچھ کہا ہے اسے ہم سرے سے رد بھی تونہیں کرسکتے ہیں۔بقول پروفیسر لطف الرحمٰن:

''نئی تنقید کے دومشہور نام ہیں۔فاروقی اور نارنگ۔دونوں ہی Fake ہیں۔تنقید بھی ایک وجدانی عمل ہے۔اس سے دونوں بے خبر ہیں،افسوسناک حد تک بے خبر۔دونوں اردو ادب ونقد کی آکاش بیل ہیں، جنہوں نے اپنے بازار چمکائے، کاروبار پھیلائے۔لیکن ادب کے رگ وریشے کا خون چوس لیا۔ان کا مقصد اعزازات وانعامات کا حصول ہے۔خود تشہیری میں کوئی کسی سے کم نہیں۔مخلص کوئی نہیں۔دونوں ہی منافق ہیں،ادب و تہذیب کے دشمن۔دنیا کے کسی ادب پر ایسا پیغمبری کا وقت کبھی نہیں آیا۔نہ ادب وفن اس طرح ہوس کے شکار ہوئے۔یہ ادبی جلاّد مسیحائی کے دعوے کے ساتھ سامنے آئے۔ایک نے ادب پر شبخون مارا، دوسرے نے اردو ادب کا بھگوا کرن کرنے کی

کوشش کی۔ گوہر شاہ وار اور خزف ریزوں میں تمیز سے عاری یہ دونوں ہی ادب میں چنگیزی کردار ادا کرتے ہیں"۔

(پیشِ آہنگ۔تنقیدی مکالمے۔ص:۱۱)

پھر آگے لکھتے ہیں:

"اردو افسانے پر بھی ان کی بعض تحریریں موجود ہیں لیکن فاروقی میں تحلیل و تجزیہ، معروضیت، سنجیدگی، ٹھہراؤ اور علمی اندازِ فکر و نظر کی نمایاں کمی ہے۔ حالاں کہ جدیدیت کے نقاد کی حیثیت سے بحیثیت مجموعی وہ مستند نہیں ہیں۔ مابعد جدیدیت کو اردو میں سب سے پہلے گوپی چند نارنگ نے روشناس کرایا اور یہ کم بات نہیں ہے کہ اردو والوں کو اس طرزِ تنقید سے آشنا کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی ساری تحریریں مانگے کا اجالا ہیں۔ اپنا کچھ بھی نہیں۔ علمی گہرائی اور مطالعے کی کمی ان کی تنقیدی فکر کی راہ میں سب سے زیادہ حائل ہے۔ وہ خود سوچ نہیں سکتے، ترجمے کر سکتے ہیں"

(اقتباس۔انٹرویو۔"سہیل" کولکاتا)

اور ایسا انہوں نے کیوں کہا اس کی وضاحت یوں کی ہے:

"فنکار کے لئے بوطیقا کا احترام ناگزیر ہے۔ قاری کے لئے اس کی شرط نہیں۔ قرأت متن کی کوئی بوطیقا نہیں۔ مسرت سے بصیرت تک قاری کا سفر وجدان کا رہینِ منت ہے۔ صحرا سے نکلنے کا راستہ صحرا کے درمیان سے گزرتا ہے۔ نئی تنقید ان تقاضوں کی تکمیل میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ خواہ وہ فکشن کی تنقید ہو کہ شاعری کی۔ نئی تنقید گمراہیوں کا شکار ہے۔ نیا تنقیدی منظر

نامہ افسوسناک حد تک افراط وتفریط کی تاریخ ہے“۔

(پیشِ آہنگ۔تنقیدی مکالمے،ص:۱۴)

بلاشبہ پروفیسر لطف الرحمٰن کے تنقیدی وتحقیقی مضامین اردو تنقید وتحقیق کو نہ صرف اعتبار بخشتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں جو صدق دل سے تمام تر گروہ بندی وگروپ بندی سے دامن بچاتے ہوئے دنیائے ادب میں اپنے فکر ونظر کے چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔پروفیسر رحمٰن ادب کو حقیقت ہستی کے عرفان وادراک کا بہتر ذریعہ تصور کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مطالعۂ ادب کی اہمیت جگہ بہ جگہ تحریر کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک انسان کے اندرون کی تاریکی صرف اور صرف مطالعہ ادب سے ہی دور ہوسکتی ہے۔ان کے شعری مجموعے کے مقدمے اور تنقیدی مضامین میں مطالعہ ادب کی تاریخی اہمیت وافادیت کے متعلق اقتباسات دیکھے جاسکتے ہیں۔ملاحظہ کیجئے:

”جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو حقیقت ہستی کے عرفان وادراک کا بہترین ذریعہ بلاشبہ تخلیقی تخیل ہے۔چوں کہ ادب کا تعلق انسان کی جذباتی ،احساساتی اور روحانی زندگی سے ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت مسلّمہ ہے کہ رموزِ حیات وکائنات کے عرفان وآگہی کا بہترین ذریعہ ادب ہے۔ادب وفن ہی کسی قوم یانسل کی قوتِ حیات کا مظہر ہوتے ہیں۔تاریخ کی کسوٹی پر کسی معاشرے کی تخلیقی توانائی اور تہذیبی عظمت کی پرکھ اس کے فنون لطیفہ ہی کے ذریعے کی جاتی ہے۔فنونِ لطیفہ ہی انسان کی ذہنی سالمیت اور فطرت سے اس کی داخلی ہم آہنگی کا بہترین ثبوت ہیں ۔روحانی واخلاقی انحطاط کے ساتھ ہی کسی قوم کی تخلیقی و

جمالیاتی توانائی بھی زوال پذیر ہو جاتی ہے حقیقی مذہبی عرفان کی طرح ادب العالیہ کی تخلیق بھی فرد کی داخلی تنہائی، خلوت گزینی، وسیع المشربی اور آزاد خیالی کی رہینِ منت ہے۔ فن کی تخلیق میں ان عناصر کے درمیان جو چیز اعتدال، توازن اور امتزاج کو برقرار رکھتی ہے، وہ تخلیقی تخیل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جمالیاتی اور حسیاتی پیکر کو منطقی اظہار تک پہنچانا تخلیقی تخیل ہی کا کارنامہ ہے"

(مقدمہ، فنونِ لطیفہ اور تخلیقی تخیل، ۲۰۱۱ء۔ص:۸)

"تخلیق صاحبِ تخلیق کی باطنی بے کرانیوں کا مظہر ہوتی ہے۔ وقت، معاشرے اور تہذیب کی تبدیلیوں کے ساتھ اس کی معنویت کی تعبیر بھی بدل جاتی ہے۔ معنویت کے نئے نئے آفاق روشن ہوتے ہیں۔ انسان کے خارجی وداخلی سروکار میں تبدیلی تفسیرِ تخلیق میں تغیر پیدا کرتی ہے۔ تخلیقی تخیل ازل سے ابد تک کا احاطہ کرتا ہے۔ یہی ان کی روحِ رواں ہے۔ فن کی ہر نوعیت تخلیقی تخیل کا کرشمہ ہے۔ تخلیقی تخیل انسان کے مادّی وجود سے نہیں، روح سے وابستہ ہوتا ہے"۔

(پیشِ آہنگ "تنقیدی مکالمے" ۲۰۰۸ء، ص:۹۔۱۰)

"مطالعہ ادب انسان کی نفسیاتی صحت کی ضمانت ہے۔ ذہنی وسعت وترفع کے لئے یہ ناگزیر ہے اس سے خارجی وداخلی زندگی میں اعتدال وتوازن پیدا ہوتا ہے۔ اخلاقی تسکین وتسلی ہوتی ہے۔ اجتماعی معاشرے میں فرد کی من مانی غدّاری ہے۔ انسانیت کے خلاف بھیانک غدّاری۔ مطالعۂ ادب اس کا

طرف وہ انگریزی حکومت میں ملازم تھے تو دوسری طرف ہندوستانی سماج کا ایک بڑا طبقہ اور بالخصوص پڑھا لکھا طبقہ انگریزوں کے خلاف کھل کر آنے کو تیار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید اپنے حکیمانہ فکری بصیرت سے کام لے کر اس مرض کا علاج کرنا چاہتے تھے جس میں مبتلا ہو کر ہندوستانی قوم ناامیدی و مایوسی اور احساسِ کمتری کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ 1857ء کی پہلی جنگِ آزادی میں ہماری ناکامیوں نے انگریزوں کے حوصلے بڑھا دیئے تھے اور اب انگریزی حکومت کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اب انگریز طرح طرح کی سازشوں اور حکمت عملیوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کا استحصال کرنے لگے تھے بالخصوص ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی کر کے ہماری اتحادی قوت کو کمزور کرنے لگے تھے۔ سرسید احمد کی دوراندیش نگاہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکی تھی کہ اب انگریز مذہب کے نام پر ہم ہندوستانیوں کو تقسیم کر کے اپنا سامراج مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اسی وقت ہم وطنوں کے دلوں میں حب الوطنی کی چنگاری کو جگایا نہیں گیا تو ہندوستانی قوم تباہ و برباد ہو جائے گی۔ ظاہر ہے اس وقت حالات اتنے مشکل تھے کہ حب الوطنی کی چنگاری کو یکبارگی ہوا دے کر شعلہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ بس ایک ہی راستہ تھا کہ انگریزوں سے دوستی بھی قائم رکھی جائے اور اپنے ہم وطنوں کو ذہنی طور پر بیدار کیا جائے۔ جیسا کہ سرسید نے خود ہی کہا ہے کہ:

> ''غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، مال واسباب کے تلف ہونے کا کچھ رنج تھا، اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور عزت

بہترین سدِ باب ہے'' (پیشِ لفظ ''تعبیر وتقدیر'' ۲۰۰۸ء ص:۱۰)

مختصر یہ کہ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اگر اپنی شاعری کے پودوں کی آبیاری خونِ جگر سے کی تو اردو تنقید کی سنگلاخ زمین میں بھی اپنے فکرِنو کے گل کھلائے۔انہوں نے نئی نسل کے سامنے یہ مثال پیش کی ہے کہ شاعری اور تنقید کی عمارت اشیائے فسوں سے تیار نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے حق جوئی اور حق گوئی لازمی شرط ہے۔پروفیسر قمر رئیس نے ان کی تنقیدی بصیرت وبصارت کی عصری معنویت کا اعتراف کرتے ہوئے بجا لکھا ہے کہ:

''انہوں نے ادبی تنقید میں جو پہچان بنائی ہے اس کی بنیاد حق جوئی یعنی ادبی ورثہ میں نئی سچائیوں کی جستجو پر ہے۔اس کے لئے بے شک انہوں نے نئے یعنی فیشن زدہ اوزار نہ ڈھونڈے ہوں لیکن جن اوزاروں سے کام لیا ہے وہ آزمودہ اور مصفّا تو ہیں ہی انہیں ان کے غور وفکر نے زیادہ کارگر اور صیقل بھی کیا ہے''۔

(پیشِ گفتار۔نثر کی شعریات۔۲۰۰۶ء، قمر رئیس)

پروفیسر لطف الرحمٰن کے متعلق عہدِ حاضر کے جید عالم ودانشور اور مفکرِ اسلام مولانا ولی رحمانی صاحب کی اس دانشورانہ تحریر کو دیکھئے جس کا حرف حرف سند کا درجہ رکھتا ہے:

''پروفیسر لطف الرحمٰن صاحب آج کی تہذیب کے ''مردِ آگاہ'' ہونے کے باوجود عجلت کا شکار نہیں ہیں، نہ سطحیت کا مرض ان کے قریب سے گزرا ہے۔وہ گہرے مطالعہ، ڈوب کر پڑھنے، غور وفکر، تحلیل وتجزیہ اور نقد ونظر کا مزاج رکھتے ہیں۔قدرت نے انہیں عقل کے وافر حصہ کے ساتھ عمدہ حافظہ سے نوازا ہے، جس

کا وہ بہترین ایجابی مصرف لیتے ہیں۔ مرحلہ تحریر کا ہو یا تقریر کا،
وہ کھرے اترتے ہیں اور پڑھنے اور سننے والوں پر گہرا اثر
چھوڑتے ہیں عام زندگی سے لے کر فکر و تحقیق کے مرحلوں تک
ان میں جو بڑا وصف نظر آتا ہے وہ قوتِ گفتار کے ساتھ جرأتِ
اظہار بھی ہے، جس سے ان کے جملے گوہرِ آبدار بن جاتے
ہیں"۔ (محمد ولی رحمانی، نقدِ نگاہ۔ ص: ۱۴۔۱۵)

پروفیسر لطف الرحمٰن نے کبھی کہا تھا کہ ؎

تو بند کردے نگاہوں کے ان دریچوں کو
کہ اب نہ لوٹ کے آؤں گا، جانتا ہوں میں

یہ حقیقت تو ابدی اور ازلی ہے کہ اب لطف الرحمٰن جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں آئیں گے لیکن ان کے فکری اثاثے ہمارے ذہن کو ہمیشہ منور کرتے رہیں گے۔ غالبؔ نے شاید اسی طرح کی ہمہ جہت اور عبقری شخصیت کے لئے کہا تھا ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

☆☆☆

اردو کا ایک روشن ضمیر نقاد۔ لطف الرحمٰن

ہماری اردو تنقید سو سال سے زائد عرصے کا سفر طئے کر چکی ہے کہ حالؔی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' اور امداد امام اثر کے ''کاشف الحقائق'' سے اردو میں باضابطہ تنقید کی بنا پڑی۔ قبل از اساتذہ کا اپنے تلامذہ کے کلام پر اصلاح یا تذکرہ نگاروں کی رائے تک ہی اردو تنقید کی دنیا محدود تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں جو تنقیدی آرا پیش کی اسے آپ چراغِ نو تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ مولانا آزادؔ کی تنقید ان کی ذاتی پسند و ناپسند تک محدود تھی اس لئے ان کی نگاہ میں استاد ذوقؔ کی شاعری کے سامنے مرزا غالبؔ کی شاعری ہیچ نظر آتی ہے۔ یا پھر دوسرے شعراء پر بھی ان کا تبصرہ محض برائے تبصرہ ہی ہے۔ مگر پھر بھی بقول پروفیسر کلیم الدین احمد ''آزادؔ دنیائے تنقید میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں بناتے لیکن ''آبِ حیات'' پرانے تذکروں پر فوقیت رکھتی ہے''۔ لیکن بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد مغربی نظریۂ نقد کے اثرات نے اردو تنقید کی فضا کو سازگار کیا اور اب اردو تنقید کے معیار و وقار کا خیال رکھا جانے لگا۔ نتیجتاً تنقید کی اہمیت وافادیت تسلیم کی جانے لگی لیکن مغربی فکر نے مشرقی نظریۂ نقد کا بیرہ غرق کر دیا۔ حالؔی، اثرؔ اور شبلؔی کے افکار و نظریات سے استفادہ کرنا معیوب اور کم علمی تصور کیا جانے لگا جب کہ مغربی نقادوں کے افکار و نظریات کی نقالی کو دانشوری سمجھا جانے لگا۔ اب تخلیق کار آئینۂ تنقید میں اپنی مکمل تصویر دیکھنے کا اضطراب لئے ناقدینِ ادب کے حضور میں سلام پیش

کرنے لگا۔تخلیق کار کی یہ جی حضوری ایک طرف تنقیدی سرمایے میں اضافے کی باعث بنی تو دوسری طرف تنقید کے نام پر قصیدہ و تنقیص کا انبار جمع ہونے لگا۔گروہ بندی پروان چڑھنے لگی اور تنقید میں یہ روش عام ہونے لگی کہ ''تم مجھے برا نہ کہو اور میں تمہیں اچھا لکھوں''۔یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید کی ایک صدی مکمل ہونے کے بعد بھی افقِ تنقید پر بس انگلیوں پر گنے جانے والے درخشاں ستارے نظر آتے ہیں۔ترقی پسند تحریک جس نے ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے کا کارنامہ انجام دیا لیکن ترقی پسند نے تو تنقید کے بنیادی تقاضے کو ہی پسِ پشت ڈال دیا کہ بونے کو بھی قد آوری بخشنے کے لئے غور وفکر کے تمام دروازے بند کر لئے گئے اور یہ تمیز ختم ہوگئی کہ اصطبل میں گھوڑا کون ہے اور گدھا کون۔پھر اس کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے تو ہمارے نقادوں کی عاقبت ہی خراب کردی کہ اردو تنقید مغربی تنقید کا چربہ بن کر رہ گئی۔مشرقی فکر ونظر کو ہیچ جانا گیا اور مغربی نظریے کی وکالت کو ایمان سمجھا جانے لگا۔لیکن اس دورِ کشاکش میں بھی چند ایسے صحت مند فکر ونظر کے نقاد ابھرے جنہوں نے اپنے خونِ دل سے شجرِ نقد کی آبیاری کی اور جس سے اردو تنقید ثمر آور ہوئی۔ان میں ایک پروفیسر لطف الرحمٰن کی حیثیت بھی مسلّم ہے۔

یوں تو لطف الرحمٰن بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور ایک جنیون فنکار تھے کہ ان کی شعری تخلیقات زندگی کے تمام تر زیر و بم کی آئینہ دار ہے۔لیکن وہ ایک بالیدہ و پختہ تنقیدی شعور کے مالک تھے اور ان کی تنقیدی بصیرت و بصارت ان کی روشن ضمیری کی ترجمان تھی۔ان کی تنقیدی تخلیقات کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ لطف الرحمٰن نے شریعتِ نقد کی نہ صرف پاسداری کی ہے بلکہ بہتوں کو کافر ہونے سے بچایا بھی ہے۔کیوں کہ ان کا واضح نظریۂ نقد یہ تھا کہ:

''ادب اور تنقید میں چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن فنی تنقید کی

سرحدوں کا آغاز تخلیق کی تکمیل کے بعد ہوتا ہے۔ تنقید کا بنیادی مقصد فنکار اور قاری کے درمیان سازگار فکری اور جمالیاتی مفاہمت اور جذبہ واحساس کی ہم رشتگی کا فروغ ہے۔ نقاد قاضی، مفتی یا فقیہہ نہیں ہوتا کسی حد تک مدرس ہوسکتا ہے۔ نقادوں پر قارئین کے ذوقِ ادب وفن اور احساسِ جمال کی تہذیب وتحسین کی ذمہ داری تو یقیناً عائد ہوتی ہے۔ (نقدِ نگاہ۔ص:۱۱)

یا پھر:

''تنقید انسانی جبلت ہے۔ انسان کا کوئی عمل تنقیدی احساس و شعور سے بے نیاز و بے تعلق نہیں ہوتا...... تخلیقِ ادب انسانی وجود کا سب سے گراں قدر اور اعلیٰ ترین عمل ہے۔ ادب تجربۂ حیات کی آئینہ داری نہیں بلکہ اس کی تخلیقِ نو ہے۔ ادب روحانی بصیرتوں اور انسانی زندگی کے درمیان ایک رابطے کا نام ہے۔ شاعر اندیکھی دنیاؤں کا پروہت ہوتا ہے۔ وہ ایک مقدس تخلیق کار ہوتا ہے جو تفنن طبع کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا حسن کار ہوتا ہے جو اپنے سماج اور معاشرے میں مختلف سطحوں پر انسانی آرزومندیوں کی تشریح وتوضیح کرتا ہے۔ وہ سماجی صحت، تہذیبی نفاست، مساوات واخوت اور آزادی ضمیر کا نگہبان ہوتا ہے''

(مقدمہ ''نقدِ نگاہ''، ۲۰۰۶ء۔ص:۹)

مذکورہ اقتباسات لطف الرحمٰن کے تنقیدی وژن کے محور ومرکز ہیں اور اس لئے وہ اردو تنقید کی موجودہ روش سے مطمئن نہیں ہیں اور انہیں یہ شکایت ہے کہ:

''نقاد کے منصب پر فائز ہونے کی شرط اولین ادبی جمالیات اور

شعری روایات و مسلمات کی معتبر آگہی اور شعور و احساس ہے۔
مگر مسلمہ کذّاب جیسے پیغمبری کے جھوٹے دعویدار مذہب ادب میں بھی ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں۔ آج بھی کچھ کم سوار بزعم خود امام نقد و فن اور ادبی نظریہ سازی کی مدعی ہیں جو طریقہ وضو سے بھی ناواقف ہیں۔ عالم یہ ہے کہ اشعار کے متن کی صحیح ادائیگی کی قدرت بھی نہیں۔ اردو شعریات و جمالیات سے دور کا رشتہ بھی نہیں ہے مگر دعویٰ بہت بڑا ہے...... موجودہ اردو ادب بھی ایسے گوپیوں سے اچھوتا نہیں جو کرشن چندر ہونے کی مدعی ہیں'' (نقدِ نگاہ۔ ص:۱۲)

لطف الرحمٰن کی نگاہ میں تنقید نگاری ایک عملِ کوہ کنی ہے اور یہ عمل غیر معمولی ذہانت متانت کا متقاضی ہے۔ لیکن افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ بحرِ تنقید میں ایسے ایسے لوگ کود پڑے ہیں جو ہنرِ غوّاصی کے معاملے میں بالکل کورے ہیں۔ بقول پروفیسر لطف الرحمٰن:

''نقادوں کا طریقہ کار ہی کسی تخلیق کے مختلف ابعاد کو منور کرتا ہے۔ متن میں دخل اندازی کے بغیر۔ ہر تخلیق قاری کی صاحب نظری کی منتظر ہوتی ہے۔ صاحبِ نظر قاری ہی نقاد ہوتا ہے۔ نقاد تخلیق کو اپنے باطن میں جذب کرتا ہے۔ اپنی داخلیت میں اس کی تخلیق نو کرتا ہے اور اپنے شعور میں اس کی باز آباد کاری کرتا ہے۔ تب منتقد کی تعبیر و تفسیر معتبر ہوتی ہے۔ نئی تنقید اس اعتبار سے بہت نادار ہے'' (تنقیدی مکالمے۔ ص:۱۱)

لطف الرحمٰن اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ:

''نظریہ سازی، اصول طرازی اور ادعائیت تنقید کا شیوہ نہیں، اسے اپنے حدود کی خبر ہونی چاہئے، نئے نقادوں کی اکثریت احساسِ کمتری کی گرفت میں ہے۔ فاروقی اور نارنگ کی پھیلائی ہوئی گمرہی حجاب بن گئی ہے۔ تعصب وتنگ نظری، کج فہمی اور جہالت نئے نقادوں کی تخصیص ہے'' (تنقیدی مکالمے۔ص:۱۲)

اس لئے لطف الرحمٰن جب عصرِ حاضر کے دونامور ناقدینِ ادب کے تنقیدی اثاثے کا جائزہ لیتے ہیں تو انہیں مایوسی ہوتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

''نئی تنقید کے دو مشہور نام ہیں۔ فاروقی اور نارنگ۔ دونوں ہی Fake ہیں۔ تنقید بھی ایک وجدانی عمل ہے۔ اس سے دونوں بے خبر ہیں، افسوسناک حد تک بے خبر۔ دونوں اردو ادب ونقد کی آکاش بیل ہیں، جنہوں نے اپنے بازار چمکائے، کاروبار پھیلائے۔ لیکن ادب کے رگ وریشے کا خون چوس لیا۔ ان کا مقصد اعزازات وانعامات کا حصول ہے۔ خود تشہیری میں کوئی کسی سے کم نہیں۔ مخلص کوئی نہیں۔ دونوں ہی منافق ہیں، ادب و تہذیب کے دشمن۔ دنیا کے کسی ادب پر ایسا پیغمبری کا وقت کبھی نہیں آیا۔ نہ ادب وفن اس طرح ہوس کے شکار ہوئے۔ یہ ادبی جلاّد مسیحائی کے دعوے کے ساتھ سامنے آئے۔ ایک نے ادب پر شبخون مارا، دوسرے نے اردو ادب کا بھگوا کرن کرنے کی کوشش کی۔ گوہر شاہ وار اور خزف ریزوں میں تمیز سے عاری یہ دونوں ہی ادب میں چنگیزی کردار ادا کرتے ہیں''۔

(پیشِ آہنگ۔ تنقیدی مکالمے۔ص:۱۱)

واضح ہو کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی سے لطف الرحمٰن کے دیرینہ روابط رہے ہیں اور ان کی نگاہ میں ان دونوں شخصیات کی عظمت بھی ہے کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعہ ''بوسۂ نم'' کا انتساب شمس الرحمٰن فاروقی اور ''راگ براگ'' کا انتساب پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ وہ ایک روشن ضمیر نقاد تھے اور ان کی روشن ضمیری ادب میں کسی گمرہی کو قبول کرنے کو تیار نہیں اس لئے وہ یہ جانتے ہوئے کہ عصری اردو تنقید میں پروفیسر نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی دونوں کی قد آوری مسلّم ہے اور موجودہ اردو ادب کے تمام سیارے انہی کے اردگرد چکر لگاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑا اور ان دونوں کے متعلق اپنی بے باک رائیں پیش کیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم لطف الرحمٰن کی اس رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن اس حقیقت کا اعتراف تو کرنا ہی ہوگا کہ لطف الرحمٰن ادب میں بھی جمہوری تقاضے کے پاسدار تھے اور وہ آزادئ اظہارِ خیال کے علم بردار۔ ظاہر ہے بے باک اور دوٹوک رائے وہی شخص دے سکتا ہے جو کسی مصلحت پسندی کا شکار نہ ہو اور نہ کسی ذاتی مفاد کا خواہاں۔ ورنہ ان دونوں شخصیات پر زبانی تبصرہ کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن تحریری ثبوت پیش کرنے والے کتنے ہیں؟

یہ ذکر پہلے آچکا ہے کہ لطف الرحمٰن بنیادی طور پر ایک تخلیقی فنکار تھے اور شاعری کو ہی اپنے ذہنی آسودگی کا سامان سمجھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے پانچ شعری مجموعے ''تازگیِ برگِ نوا، بوسۂ نم، دشت میں خیمۂ گل، صنم آشنا، اور راگ براگ'' نہ صرف اردو شاعری کے لئے بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ لطف الرحمٰن کی تخلیقی کائنات کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن اردو تنقید بھی ان کے لئے صرف ''خون لگا کر شہید ہونے'' جیسی شئے نہیں رہی بلکہ انہوں نے اردو تنقید نگاری میں بھی اپنی شناخت مستحکم کی اور ان کل وقتی نقادوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اردو تنقید

کے لئے بھی ان کا ذہن کس قدر زرخیز ہے۔ان کی سات تنقیدی کتابوں کے علاوہ سینکڑوں مضامین، تبصرے اور تقاریظ اس حقیقت کو عیاں کرتی ہیں کہ لطف الرحمٰن ایک صحت مند فکر ونظر کے مالک تھے اور وہ اردو ادب کے ایک باخبر نقاد تھے۔ان کی نگاہوں میں مشرقی تنقید کے گنجہائے گراں مایہ کی اہمیت مسلّم تھی اور وہ مغربی تنقید سے بھی بیر نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تو عقیدہ تھا کہ ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ان کی تنقیدی تصانیف ''جدیدیت کی جمالیات (۱۹۹۳ء)، نثر کی شعریات (۲۰۰۶ء)، نقدِ نگاہ (۲۰۰۶ء)، تعبیر وتقدیر (۲۰۰۸ء)، تنقیدی مکالمے (۲۰۰۸ء)، فنونِ لطیفہ اور تخلیقی تخیل (۲۰۱۱ء) اور تنقید وتخلیق (۲۰۱۱ء) کے مطالعے سے لطف الرحمٰن کی تنقیدی بصیرت وبصارت عیاں ہوتی ہے اور یہ عقدہ بھی کھلتا ہے کہ لطف الرحمٰن نے اپنی تنقید کو بے جا مدلل مداحی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور تخلیق کو اپنے میزانِ شعور پر پرکھ کر نتیجہ اخذ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے وہ ایک تخلیق کار کے لئے بھی یہ شرط لازم کرتے ہیں کہ:

''فنکار کی کامیابی کا راز شے کی شیئیت کی تجسیم سے وابستہ ہے، جو فنکار انسان یا اشیائے کائنات کی روح یا جوہریت کی تجسیم وتشکیل میں جتنا کامیاب ہوگا، اسی مناسبت سے اس کے فن میں ابدیت کا حسن روشن ہوا، عظیم فنی تخلیق ہر عہد کی حسیت میں شامل ہو جاتی ہے اور ہر عہد میں جدید رہتی ہے، یہ ایک عظیم الشان فن کی بنیادی تخصیص ہے، یہی تخصیص فن کو میکنزم سے الگ کرتی ہے''(تنقید وتخلیق۔ص:۸)

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ اقتباسات محض مقالے کی طوالت کے لئے نہیں پیش کئے گئے ہیں بلکہ میرے عنوان کا تقاضا یہی تھا کہ اولاً لطف الرحمٰن کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے بعدہٗ ان کے طریقۂ نقد پر گفتگو کی جائے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ہر باشعور انسان کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ ادیب وشاعر کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی مقصدِ حیات ہوتا ہے اسی طرح تنقید نگار کے روبرو بھی ادبی تجربات کے ساتھ ساتھ زندگی کے معاملات ومسائل اور مقاصد ہوتے ہیں۔ تنقید کے مرحلے میں وہ اپنے نقطۂ نظر کو حاوی ہونے تو نہیں دیتا مگر احتساب و تجزیہ کے بعد نتائج تک پہنچنے اور اس کو پیش کرنے میں شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ضرور حاصل کرتا ہے اور نقطۂ نظر کی یہی روشنی اس کی تحریروں کی سمت متعین کرتی ہے۔ لطف الرحمٰن کی تنقید روایتی تنقید کے آگے کے مراحل کو طئے کرتی ہے اور مروجہ طرزِ نقد سے دامن چھڑاتے ہوئے اپنے لئے ایک نئی راہ متعین کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے گہرے تاریخی شعور اور جدید ترین نظریاتِ نقد سے آگہی کی بدولت اپنی تنقیدی آرا کو بامعنی، پُراعتماد اور بااعتبار بنایا ہے اور یہی وصف انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔

لطف الرحمٰن نے قدیم وجدید دونوں ادب کے نثری وشعری سرمائے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فارسی اور انگریزی کے کلاسیکی ادب پر ان کی گہری نگاہ تھی اور جدید ادب تو ان کا اوڑھنا بچھونا ہی تھا۔ انہوں نے اپنی تنقید میں یہ نکتہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب محض ذہنی لذت کشی اور خیالی آوارگی نہیں ہے بلکہ حقائقِ زیست سے اس کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ لطف الرحمٰن نے حالؔی کی طرح ہی شاعری کو افادی اور مقصدی ہونے کی وکالت کی ہے۔ انہوں نے اردو کے کلاسیکی شعرا مثلاً میرؔ، میر حسنؔ، دردؔ، نظیرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ، اکبرؔ، اور اقبالؔ کے ساتھ ساتھ ترقی پسند شعراء جوشؔ، مخدومؔ،

پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اس خیال اور اس غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڑھا کر دیا۔"

بلا شبہ یہ ملک وقوم کا غم ہی تھا کہ سر سید 1857ء کے بعد انگریزی حکومت کے قریب ہوئے اور ان کے سیاسی تصورات میں قدرے تبدیلی واقع ہوئی۔ لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ انگریزوں کی قربت کی وجہ سے سر سید کے تصورِ وطن، تصورِ قوم یا حب الوطنی میں کوئی کمی واقع ہوئی ہو۔ سچائی یہ ہے کہ انگریزوں سے دوستی کے پیچھے بھی قومی مفاد پوشیدہ تھے۔ "اسبابِ بغاوتِ ہند" کے اوراق شواہد پیش کرتے ہیں کہ 1857ء کے بعد سر سید کے افکار و نظریات کے محور اور مرکز کیا تھے۔

سر سید نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ اہلِ علم لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں انگریزوں کی سازشوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے جگہ بہ جگہ جلسوں سے بھی خطاب کیا اور لوگوں کو اپنی فکر سے آگاہ کیا۔ اکثر جلسوں میں انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ہیں، ایک ہی گنگا جمنا کا پانی پیتے ہیں اور ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے ایک ہی خطہ یعنی ہندوستان میں جیتے اور مرتے ہیں پھر ہم دونوں کے درمیان یہ دوریاں کیوں کر ہیں؟ ہمارے درمیان نفرت کیوں ہے؟ سر سید کے اس طرح کے سوالوں نے ہندوستان کے دانشور طبقے کو سوچنے پر مجبور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی جماعت تیار ہوئی جو انگریزوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کی مہم میں لگ گئی۔ یہاں میں سر سید کی اس تاریخی تقریر کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے 27ر جنوری 1883ء کو پٹنہ کے ایک جلسے میں کی تھی:

"I have always said that our land of

فیضؔ، پرویز شاہدی، جمیل مظہریؔ، فرازؔ، شہر یارؔ اور مخمورؔ سعیدی پر بھر پور نظر ڈالی ہے تو نئی نسل کے شعراء ملک زادہ جاوید، پروین شیرؔ، عزیز نویںؔ وغیرہم کی شاعری کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ نثری وشعری دونوں سرمائے ان کے لئے حرزِ جاں تھے اور اپنے عمیق مطالعے کی بنیاد پر جو بات کہتے تھے اس کے لئے پختہ ثبوت بھی پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید متوازن اور صالح فکر ونظر کی آئینہ دار ہے۔ پریم چندؔ عصری ناقدینِ ادب کے لئے پیش پا افتادہ مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح ہو کہ پیش پا افتادہ مضامین پر کسی نقاد کے لئے اپنی منفرد رائے قائم کرنا صحرا میں کشتی چلانے کے مترادف ہے کہ مضامین کے انبار سے استفادہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن کوئی نیا پہلو نکالنا آسان نہیں ہے۔ لیکن لطف الرحمٰن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ پیش پا افتادہ مضامین پر بھی قلم اٹھائیں تو کوئی ایسا نقطہ ضرور پیش کریں جو نہ صرف قارئین کو متوجہ کرے بلکہ دانشوروں کی نگاہ میں فکرِ نو کا درجہ حاصل کرے۔ پریم چندؔ کے تعلق سے ان کا یہ اقتباس دیکھیں:

''پریم چند کی شخصیت وفن میں بھی یہ جمالیاتی ارتقاء منزل معراج میں ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں یہ حسن وانفرادیت ہر جگہ موجود ہے۔ آپ انہیں کسی جہت سے پڑھیں یعنی محض ایک قصہ گو کی حیثیت سے یا پھر ترقی پسند فنکار، رجعت پسند ادیب یا فرقہ وارانہ ندگی کے حامل ناول نگار کی حیثیت سے، آپ کہیں نہ کہیں یہ ضرور محسوس کریں گے کہ پریم چند صرف وہی نہیں ہیں جو آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ان کی شخصیت وفن میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اگر آپ نے دانستہ نظریں نہیں چرائیں تو آپ ضرور محسوس کریں گے کہ پریم چندؔ پر کوئی لیبل

نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ ایسے ادیبوں میں ہیں جو کسی لیبل سے
بے نیاز ہوتے ہیں'' (نقدِ نگاہ۔ص:۱۶۰)

مولانا ابوالکلام آزاد کی طرزِ نگارش پر بھی مواد کی کمی نہیں اور ہمارے بیشتر ناقدینِ ادب نے ان کی نثر نگاری پر اپنی رائیں پیش کی ہیں اور مولانا آزاد کے اسلوب کو ان کی انفرادیت قرار دیا ہے۔ لطف الرحمٰن جب مولانا آزاد کی نثری تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کا یہ اسلوب رومانی نثر نگاروں اور سرسید اسکول کے ادیبوں کے درمیان ایک حسین تخلیقی امتزاج ہے۔ مولانا کے مذکورہ اسلوب کو جو خصوصیت دوسروں سے ممیز کرتی ہے وہ ان کا قرآنی آہنگ اور تخلیقی جوہریت ہے۔ اقبال کے شعری اسلوب کی بھی یہی انفرادیت اور امتیاز تھا۔ دونوں نے قرآن کے عرفان میں ایک عمر گذاری تھی۔ دونوں ہی بلادِ اسلامیہ اور عالمگیر انسانیت دوستی کے تصور اور اسلام کی انسانیت نوازی کے قائل و قتیل تھے'' (تنقید و تخلیق۔ص:۶۱۔۶۲)

اور جب شفیع جاوید جیسے جدید افسانہ نگار کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''شفیع جاوید نہ ادب برائے ادب کے قائل ہیں نہ ادب برائے زندگی کے۔ وہ ادب برائے دل کے امین ہیں۔ اس لئے زندگی کی ایسی کہانیاں لکھتے ہیں جن کا بنیادی تعلق دل سے ہوتا ہے جسے تفکر کی گرانقدر ہم سائیگی حاصل ہوتی ہے''

(تنقیدی مکالمے۔ص:۱۳۴)

غالبؔ اور اقبالؔ ان کے محبوب شاعر ہیں۔ ان کے مجموعہ مضامین پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ عقدہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ انہوں نے اپنے مطالعے کو غالبؔ اور اقبالؔ کی صرف اردو شاعری تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان دونوں شعراء کی فارسی شاعری کا بھی بھرپور مطالعہ کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں شعراء کے افکار و نظریات کے اصل جوہر ان کی فارسی شاعری میں کھلتے ہیں۔ غالبؔ کے متعلق فرماتے ہیں:

''مجموعی طور پر غالبؔ ایک نوآبادیاتی نظام کی لعنتوں اور برکتوں کے درمیان مصائب و شدائد کا ہدف بن کر جینے پر مجبور تھے۔ ان کا تخلیقی باطن زخم زار بن چکا تھا۔ معاشی تنگی، قرض خواہوں کے مطالبات، ناکامیوں اور نامرادیوں کا تسلسل، تہذیبی شکست وریخت، انسانیت کی بے حرمتی، حسرتوں اور محرومیوں کی یلغار، غرض کہ ایک جانِ ناتواں اور غم والم کا سلسلہ لامتناہی، غالبؔ انسان تھے، پیالہ وساغر نہ تھے۔ گردشِ مدام سے ان کا دل گھبرا گیا تھا ان کے باطنی واحساساتی ردِ عمل کا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ وہ وجودی طرزِ احساس کے ترجمان بن گئے تھے''۔

(تعبیر و تقدیر۔ ص:۱۴۹)

لطف الرحمٰن شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کو بنیادی طور پر بیدارئ باطن کا شاعر قرار دیتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبالؔ کی شاعری کا غالب پہلو عظمتِ انساں کا اعتراف ہے۔ بقول لطف الرحمٰن:

''اقبالؔ بنیادی طور پر عظمتِ انسانی کا علمبردار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اپنی تمام تر عقلی فتوحات اور سائنسی ایجادات کے باوجود

مغرب زوال پذیر ہے وہ تمام مغربی معاشرے اور صنعتی تمدن کو
کا خانۂ ابلیس کی تجلّی قرار دیتا ہے۔ فرنگ رہ گزر سیل بے پناہ کی
زد میں ہے۔ دوسری طرف وہ مشرق کی مذہبی رسم پرستی، جمود اور
تعطل سے بھی بیزار ہے۔ مشرق عقلیت میں مغرب سے بہت
پیچھے رہ گیا ہے۔ اقبالؔ کے مطابق مشرق روحانیت کا بھی وارث
ہے اور عقلیت کی رہبری بھی کر چکا ہے''۔

(تعبیر وتقدیر۔ص:۲۳)

جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ لطف الرحمٰن کے مطالعے کا محور صرف کلاسیکی ادب نہیں بلکہ ترقی پسند ادب، جدید ادب اور مابعد جدید ادب بھی رہا ہے اور انہوں نے جن فنکاروں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے ان کے افکار ونظریات کی زیریں لہروں تک رسائی حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ عہدِ جدید کے نامور شاعر شہریارؔ کی شاعری کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

''ان کی غزلیں تجربات عشق کے ابلاغ میں محاکاتی قوت اظہار
رکھتی ہیں۔ ان کی نظمیں قارئین کے جمالیاتی وجدان کو منور کرتی
ہیں۔ تخلیقی حرارت اور شعلۂ ادراک کی تابندگی معنی بر جستہ کو
نفاست ونور کا آئینہ خانہ بناتی ہے۔ ان کے اسلوب میں لفظوں
کے عام معانی اور اصطلاحی اور استعاراتی مفاہیم میں خوشگوار
مفاہمت اور دلبرانہ رفاقت ملتی ہے۔ ان کی تخلیقی سرشاری اور
فطری بے ساختگی انہیں سر اہل سخن کی تخصیص بخشتی ہے''۔

(فنونِ لطیفہ اور تخلیقی تخیل۔ص:۹۹)

اور نئی نسل کے شاعر ملک زادہ جاویدؔ کی شاعری کا جب تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو جاویدؔ

کی شاعری کو عہدِ حاضر کے باطن کا استعارہ قرار دیتے ہیں اور ان سے بہت ساری امیدیں بھی وابستہ رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ملک زادہ جاوید کی شاعری رسمی یا روایتی شاعری نہیں بلکہ یہ ایک جذباتی ضرورت اور روحانی طلب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں بھی مضامین غیب سے آتے ہیں۔ یہ الفاظ دیگر گرمیٔ نشاط تصور انہیں نغمہ سنج رکھتی ہے۔ یہ شاعری بالکل نئی ہوتے ہوئے بھی کلاسیکی وقار، سنجیدگی اور میر تقی میر کی طرح ظرف غم اندوزی رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر شعر ایک نامیاتی پیکر کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے طور پر باطنی حسن کا ایک ایسا خارجی اظہار ہے جو ایک نئے جمالیاتی شعور کا زائیدہ ہے۔ ملک زادہ جاوید کی شاعری میں عصری زندگی کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقی انفرادیت یہی ہے کہ انہوں نے اپنے باطن کے آتش فشاں کو گلزار بنا کر پیش کیا ہے اور اس جہت سے ان کی شاعری اپنی تہذیبی انتشار کی جمالیاتی تفسیر ہے''

(فنونِ لطیفہ اور تخلیقی تخیل۔ ص:۱۴۳)

مختصر یہ کہ لطف الرحمٰن نے جن شعراء و ادبا پر اپنی تنقیدی آرا پیش کی ہیں ان کی تخلیقات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے اور رسمی تنقید سے پرہیز کرتے ہوئے اپنی روشن ضمیری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ عصرِ حاضر میں لطف الرحمٰن جیسے روشن ضمیر، بے باک اور وسیع القلب ونظر اور وسیع المطالعہ ناقد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اس لئے آنے والی نسل کے لئے لطف الرحمٰن کے تنقیدی سرمائے چراغِ راہ ثابت ہوں گے اور اردو کے انتقادی ادب میں بیش بہا خزانہ قرار پائیں گے۔ جیسا کہ پروفیسر وہاب اشرفی

جنھوں نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''تاریخ ادب اردو'' میں پروفیسر لطف الرحمٰن کو بطورِ شاعر پیش کیا اور نقاد کے خانے میں ڈالنے سے گریز کیا انہیں بھی یہ اعتراف تھا کہ:

''لطف الرحمٰن کے یہاں انسانی تباہی کے خوف کا احساس ان کی تنقید کے مرکزی تصور پر دال ہے۔ نئے شعروادب کا یہ مزاج معلق نہیں ہے نتیجے کے طور پر تنقید کا کیف بھی اسی سے پیدا ہو رہا ہے۔ لطف الرحمٰن کی دل سوزی اور درد مندی کا Perspective بھی یہی ہے چنانچہ ان کی تنقیدی روش میں اخلاقی قدروں کا احترام ایک روشن لکیر ہے جن کی شکست وریخت حقیقتاً انسان کی شکست وریخت ہے، تباہی وبربادی ہے۔ لطف الرحمٰن کی فنی تنقید اسی احساس کو جگاتی اور انسان، انسانیت اور دنیا کی سالمیت کے خطرات کو آئینہ دکھا کر ذی ہوش اور دانش مند بنانے کا مشکل کام سرانجام دیتی ہے۔ لطف الرحمٰن انسانیت کی مثبت سرشت کے قائل تو ہیں لیکن اسے گھن لگانے والے عناصر کی طرف نشاندہی کر کے ایک طرح سے بڑی طاقتوں کی لائی ہوئی بیماریوں کے علاج کے لئے بڑی سنجیدگی سے فکر مند ہیں یعنی ان کی تنقید کی ایک واضح سمت ہے اور یہ سمت Milk of Human Kindness کے ورثے کے احترام سے پیدا ہوتی ہے اردو کے کم نقاد ایسا منظر نامہ پیش کرتے ہیں'' (''جدیدیت کی جمالیات'' ۱۹۹۳ء۔ اردو تنقید کا نیا نصاب۔ از وہاب اشرفی، ص:۱۱)

☆☆

کتھا دیس کا البیلا باسی ۔ مشتاق احمد نوری

اردو فکشن میں بہار کا سکہ ہر زمانے میں چلا۔ پریم چند کی جانشینی کا حق سہیل عظیم آبادی نے جس طرح ادا کیا اس کی مثال کہاں ہے؟ حد تو یہ ہے کہ پریم چند کے نگر میں ہی اپنی جان بھی دے دی۔ ان کے بعد غیاث احمد گدی، کلام حیدری، انور عظیم، احمد یوسف، الیاس احمد گدی، ذکی انور، شفیع جاوید، جابر حسین اور شفیع مشہدی نے اس کارواں کو آگے بڑھایا۔ خواتین میں شکیلہ اختر، قمر جہاں اور ذکیہ مشہدی نے بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑی۔ کچھ اور خواتین نے بھی اپنے جوہر دکھائے کچھ ابھریں کچھ ڈوب گئیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد فکشن کے میدان میں جدیدیت کا زبردست بھونچال آیا۔ فکشن کی دنیا کے لعل و گہر بہار میں چمکے بلکہ اس دور کی نمائندگی بھی بہار کے سر رہی۔ شوکت حیات، شفق، حسین الحق، عبد الصمد، علی امام، شموئل احمد، عبید قمر اور مشتاق احمد نوری نے کم و بیش ایک ساتھ لکھنا شروع کیا۔ ہر کا اپنا اپنا اسٹائل رہا۔ ہر کی اپنی پہچان بنی اور آج بھی اردو فکشن میں ان کے نام کا اعتبار باقی ہے۔

جدیدیت کے دور میں جب کہانی سے کہانی پن کا اخراج ہو رہا تھا اور اسے پہیلی کے زمرے میں رکھا جا رہا تھا اس زمانے میں بھی مشتاق احمد نوری نے خود پر جدیدیت طاری نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے اعتدال پسندی کی جو راہ اپنائی اس نے انہیں منہ کے بل گرنے سے بچالیا۔

ان کا تعلق چونکہ گاؤں سے رہا ہے۔ ان کا بچپن گاؤں کی گلیوں میں گذرا وہاں کی آب وہوا ان کی شخصیت کا حصہ بنی۔ گاؤں کی معصومیت وہاں کا خلوص اور بھائی چارگی کے درمیان انہوں نے جوانی کی دہلیز پار کی۔ بعد میں یہ ساری چیزیں ان کی کہانیوں کے تیور طے کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔

نوری کی کہانی 'دو روپ'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی جب وہ اسکول کے طالب علم تھے۔ ۱۹۷۱ء میں گریجویشن تک ان کے لکھنے کی رفتار قدرے سست رہی۔ ۱۹۷۲ء سے ان کی کہانیاں مختلف رسائل میں تواتر سے شائع ہونے لگیں اور ۱۹۷۸ء سے مشتاق احمد نوری کی شناخت ایک معتبر افسانہ نگار کی حیثیت سے ہونے لگی۔

مشتاق احمد نوری کا پہلا افسانوی مجموعہ ''تلاش'' ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا اور تقریباً ۹/سال بعد دوسرا افسانوی مجموعہ ''بند آنکھوں کا سفر'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ نوری کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے اندر کنفی ڈنس غضب کا ہے۔ وہ چاہتے تو کسی سے بھی اپنے مجموعہ کا تقریظ لکھوا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا ان کے دوسرے مجموعہ کا ابتدائیہ دیکھئے۔ مختصر جملے آپ اسے نثری نظم بھی کہہ سکتے ہیں۔

کیا آج کا فن/اپاہج ہے/کہ اسے/تبصروں، تقریظوں اور تعریفوں/کے ٹھیلے پر بیٹھا کر/ دردر/شہرت اور مقبولیت کی/ بھیک دلوائی جائے؟/زندہ/اپنے قدموں پر/چلتا ہے چلتا ہی رہتا ہے/مردہ/چار کے کندھوں پر/سوار ہو کر بھی/قبرستان ہی جاتا ہے۔

صرف درج بالا سطور سے ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں اپنے فن کے تئیں کتنا کنفی ڈنس (Confidence) ہے ان کا یہ اعتماد انہیں آگے بڑھانے میں معاون ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمارے سماج کے مختلف زاویے ابھرتے ہیں ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جس سماج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے اپنی تخلیقی کائنات کا حصہ بنالیا۔ مشتاق احمد نوری کا مشاہدہ وسیع ہے۔ اسی مشاہدے کی وجہ سے

انہوں نے کہانی کو ایک نیا تناظر دیا ہے۔نوری کے اسلوب پر گفتگو سے قبل آیئے دیکھیں کہ فکشن کے نوجوان ناقد حقانی القاسمی نے اپنی کتاب ''طوافِ دشتِ جنوں'' میں نوری کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے کیا کہا ہے:

''مشتاق احمد نوری کا اسلوب پریم چند اور رینوؔ سے مماثل ہے۔مجھے خوشی ہے کہ مشتاق احمد نوری نے رینوؔ کا Revival کیا ہے۔یوں بھی ہماری کہانی کو آج کے سیاق وسباق میں ایک رینوؔ کی ضرورت ہے۔مشتاق احمد نوری کی کہانیوں میں جذبے اور احساس کا الاؤ روشن ہے اوران کے تخیل کی پرواز بہت اونچی ہے۔وہ اپنی کہانیوں میں کبھی کبھی ڈرامائی سچویشن بھی پیدا کرتے ہیں اور یہ ڈرامائی فضاان کی کہانیوں کو حسن سے مالامال کرتی ہے۔منظر نگاری میں تو انہیں کمال قدرت حاصل ہے۔ان کے افسانوں میں کہیں کہیں طنزیہ تاثر بھی ملتا ہے اور یہ Witt ان کے افسانوں کو کافی Weight عطا کرتا ہے۔''

حقانی کا یہ کہنا کہ نوریؔ نے رینوؔ کا Revival کیا ہے یہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ نوریؔ کے افسانوں کا خمیر گاؤں کی مٹی سے ہی تیار ہوتا ہے چونکہ رینوؔ کے گاؤں سے نوریؔ کا گاؤں صرف ۲رکیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ان دونوں فنکاروں کی ملاقاتیں بھی رہی ہیں اور نوریؔ نے رینوؔ سے فیض بھی حاصل کیا ہے۔

گاؤں کے تناظر میں نوریؔ کی کئی کہانیاں ہیں۔جن کی سواری، نہ سمجھ میں آنے والی بات، ایک معمولی سی بات، خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

''جن کی سواری'' میں ایک لڑکی پر جن کی سواری آتی ہے اور وہ پورے گاؤں بلکہ اڑوس پڑوس کے گاؤں میں بھی کافی مشہور ہو جاتی ہے جب قمر آرا پر جن کی

سواری آتی ہے تو ہر شخص کے متعلق ایسی باتیں کہنے لگتی ہے جس سے عام لوگ کسی بھی طرح واقف نہیں ہوتے۔ چونکہ اسرار و رموز کی وہ باتیں بالکل درست ثابت ہوتی ہیں اس لئے ماں کے بیحد اصرار کے بعد بھی کہانی کا راوی قمر آرا کے پاس نہیں جاتا کہ وہ کہیں اس کے اندر کی غلاظت اور خامیوں کو ظاہر نہ کر دے۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنی کتاب ''مابعد جدیدیت مضمرات وممکنات'' میں اس کہانی پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کہانی میں طلسمی اور مابعد الطبیعاتی عناصر کی بڑی کارفرمائی ہے۔ ڈاکٹر راشد انور راشد نے ''جن کی سواری'' پر بحث کرتے ہوئے بہت باریکی سے اس کا جائزہ لیا ہے:

> ''مشتاق احمد نوری کا افسانہ ''جن کی سواری'' ذہنی پیچیدگیوں کو فنکاری کے ساتھ اجاگر کرتا ہے۔ تخلیقی عمل کے دوران وہ تخیل کی وادیوں میں سیر کرنے کی بجائے عصری ناہمواریوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعات سے کہانی کا تانا بانا تیار کرنے کی روش بہت پرانی ہے جو کامیابی کی منزلوں سے تبھی ہمکنار ہوتی ہے جب عام سا واقعہ فکشن کے روپ میں ڈھل جائے۔ دراصل یہیں پہ افسانہ نگار کی مہارت پرکھی جاتی ہے۔ مشتاق احمد نوری نے عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو فن کاری کے ساتھ فکشن کا روپ دیا ہے۔ ''جن کی سواری'' سیدھے سادھے انداز میں زندگی کے ایک مسئلہ کو بیان کرتی ہے۔
>
> مشتاق احمد نوری نے اس کہانی کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک چور چھپا ہوتا ہے۔ دنیا

India is like a newly-wedded bride whose two beautiful and luscious eyes are the Hindus and the Musalmans; If the two exist in mutual concord the bride will remain for ever resplendent and becoming, while if they make up their mind to see in different directions the bride is bound to become squinted and even partially blind".

(Sayyid Ahmad Khan: by K.A. Nizami-Edition, 1966, P 144)

چند محدود ذہن اور تنگ نظر لوگ سرسید احمد پر یہ الزام تراشتے ہیں کہ انہوں نے صرف مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی بدحالی کا رونا رویا ہے اور انہیں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کی اور ان کے مخاطب صرف مسلمان رہے ہیں۔ان کی تقاریر اور مضامین اس حقیقت کی عکاس ہیں کہ ان کی فکر ونظر کا محور کبھی بھی صرف مسلمان نہیں رہے۔ان کی سانسوں میں اس وقت کا ہندوستان بستا تھا اور وہ اپنے ملک وقوم کی دردناک صورتحال کو دیکھ کر مضطرب تھے اور اس دردمندی نے ان کی تقریروں اور تحریروں میں سوز وگداز بھر دیا تھا۔ایک مثال دیکھئے:

''پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو اور میری قوم کے بچو اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کروتا کہ آخر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعاء ہے

والے اسے دیکھ نہیں پاتے لیکن جب کبھی وہ خود اپنا محاسبہ کرتا ہے تو اس کا اعتماد ڈگمگانے لگتا ہے۔ جن کی سواری علامت ہے انسان کے اس بنیادی احساس کی جس کے تحت وہ اپنے آپ کو ڈھیر ساری غلاظتوں میں الجھا پاتا ہے حالانکہ باہر سے وہ بالکل صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے اور ہر لمحہ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو بھی اس کے اندر انسان کا انداز.ہ نہ ہو"۔

("انسانوں کا نیا معنوی استعارہ"۔۵۔۶، دہلی)

عصری انسانوں کا المیہ یہ ہے کہ اس سے کوئی لازوال کردار ابھر کر سامنے نہیں آرہا ہے۔ آپ نورؔی کے افسانہ" گلاب بابو" کے گلاب بابو اور" شمائلہ" کی ننھی شمائلہ کو بھلا سکیں گے؟ یہ دونوں کردار ایسے تراشے ہوئے ہیں کہ انہیں بھول پانا بہت مشکل ہے۔ میں افسانے کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ دونوں کہانی پڑھنے کے بعد ہر کوئی میری بات سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

نورؔی کی مشہور ترین کہانی" لمبے قد کا بونا" ہے۔ بونے کے کردار پر اردو فکشن میں اس سے قبل کوئی کہانی نہیں ملتی۔ ایک بونا مکمل آدمی ہوتا ہے صرف اس کے ہاتھ پاؤں چھوٹے ہوتے ہیں اس کی ذہنی نشوونما میں کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن سماج اسے مکمل آدمی کا درجہ نہیں دیتا اور اسے صرف مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

نورؔی نے نہ صرف اس بونے کی سائیکی میں اترنے کی کوشش کی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی صلاحیت اس کے قد کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کہانی کا راجنؔ مرکزی کردار ہے جو انگریزی آنرس کے ساتھ بہت اچھا مقرر بھی ہے۔ اس کے اندر تخلیقی صلاحیت بھی ہے اور سرکس کے ہر شو کو اپنے الگ آئیٹم سے جاندار بنا دیتا ہے ۔سرکس کی ایک خوبصورت دوشیزہ شالوؔ سے اس کا پیار اس خوبصورتی سے پنپا ہے کہ

آپ اسے محیر العقول ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ اس پیار کو اتنے فطری انداز میں پروان چڑھایا گیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کہانی میں سرکس کے دوسرے کرداروں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ لوگ جو خاندان در خاندان سرکس کا حصّہ ہوتے رہے ہیں ان کی بے بسی اور مجبوری کی بہت خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔

یہ کہانی ہے تو ایک بونے کردار پر مبنی لیکن اگر آپ بین السطور پر غور کریں تو آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دراصل یہ بونا کردار اقلیت کی نمائندگی کرتا ہے اگر آپ کہانی کو اس نظریے سے دیکھیں تو اس کا ایک الگ ڈائمنشن نظر آئے گا۔

صلاحیت سے بھرپور بونا راجنؔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی اور دن کے اجالے میں اتنی خوبصورتی، سفاکی اور فنکاری سے قتل کیا جاتا ہے کہ لوگ تالیاں بجانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ قاتل کی طرف کسی کی انگلی نہیں اٹھتی وہ اپنے راستے کے کانٹے کو بہت آسانی سے صاف کر دیتا ہے اور صاف بچ نکلتا ہے۔

کیا اقلیت کے ساتھ آج یہی سب کچھ نہیں ہو رہا ہے؟؟؟

سہ ماہی ''مباحثہ'' پٹنہ کے شمارہ ۲۸ میں شکیل الرحمٰن نے ''لمبے قد کا بونا'' کا بہت خوبصورت تجزیہ کیا ہے انہوں نے نوریؔ کو سراہتے ہوئے تحریر کیا ہے :

> ''یہ مشتاق احمد نوریؔ کا متحرک کردار ہے۔ جو اردو فکشن میں زندہ رہے گا۔ مشتاق احمد نوریؔ کئی بہت اچھے افسانوں کے خالق ہیں۔ یہ افسانے اردو فکشن میں اضافہ ہیں۔ مثلاً جن کی سواری، وردان، لمبی ریس کا گھوڑا خودکشی، بند آنکھوں کا سفر، سچ، ایک مٹی نم، کھیل اندر اندر، گلاب بابو، حرف آخر، کائیں کائیں، پتھر کی لکیر وغیرہ۔ ان کے فن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ افسانہ نگار نے معمولی واقعات و کردار کے اندر

غیر معمولی سچائی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔اردو افسانے
میں بونے کی سائکی میں جھانکنے کی یہ غالباً پہلی کوشش ہے فکشن کا
اچھافنکار زندگی اوراس کے مسائل کے تجربے حاصل تو کرتا ہے
لیکن ساتھ ہی کسی نہ کسی معجزے کی تلاش میں بھی رہتا ہے۔
معجزہ ہو جاتا ہے تو وہ خود حیرت زدہ رہ جاتا ہے اوراپنے کردار
کے باطن کا عطا کیا ہوا تحیر قاری کے حوالے اس طرح کر دیتا ہے
کہ وہ معجزہ اور فنکار کا تحیر قاری کا جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔''

اس کہانی کا تجزیہ کرنے کے بعد شکیل الرحمٰن نے اس کہانی کے بارے میں اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے:

''اس کہانی میں شعور اور تحت الشعور کی کشمکش اور تصادم نے
سائیکی کے ہیجان کو قاری کے ذہن وشعور سے بہت قریب کر دیا
ہے۔اس المیہ ڈرامے میں خواب اوراثاثی نہیں ہے۔ایک زندہ
نفسی حقیقت ہے جو المیہ کردار کے زوال سے قاری کو نفسیاتی سطح
پر آسودگی بخشتی ہے۔قاری المیہ کے جمال سے متاثر ہوتا ہے۔
صلیب پر چڑھانے کے بعد لہولہان حضرت عیسیٰ کا حسن کتنے
لوگوں نے دیکھا ہوگا ہمیں معلوم نہیں البتہ ہم یہ ضرور محسوس
کرتے ہیں کہ ان کے ایسی ہی جمال میں دنیا نکھر گئی ہوگی۔دنیا
میں حسن بکھرا ہوگا ان کے لہو سے زندگی کا چہرہ دھلا ہوگا اور دنیا کو
اپنے سچے حسن کو پہچاننے میں داد ملی ہوگی۔پیتھوس
(Pathos) کو سبلائیم (Subliam) میں تبدیل کر دینا بڑا
کام ہے۔اس بڑے کام کے لئے مشتاق احمد نوری میں یقیناً

بڑی صلاحیت موجود ہے۔نوری کے پاس فکشن میں نئی دنیاؤں کو
خلق کرنے کا ایک بیدار ذہن ہے جس سے بڑی امیدیں وابستہ
کی جاسکتی ہیں''۔

اب نوریؔ کی کچھ مشہور کہانیوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تا کہ اندازہ ہو کہ اس نے اپنی کہانیوں میں معنی کے کتنے جہاں آباد کرر کھے ہیں۔

''خودکشی''نوریؔ کی ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک شخص ایک ناتواں مچھر سے مات کھا جاتا ہے اور صبح جب اس کا خون پی کر توانا ہو جاتا ہے تو وہ بڑی آسانی سے اسے مارنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ پوری کہانی میں مچھر اور انسان کا مکالمہ دیکھنے کو ملتا ہے رات جب وہ مچھر کو نہیں مار پاتا تو ایک بوڑھا مچھر اس سے کہتا ہے۔

''سنو کہ تم نائب خدا ہو۔تم اس مچھر کو اس وقت تک نہیں مار سکتے جب تک کہ اس کے اندر تمہارا خون داخل نہ ہو جائے''

''کیا بات کرتے ہو اس کی یہ مجال کہ وہ میرے جاگتے رہنے پر میرا خون اپنے اندر اتار لے''''ہم کبھی مردار کا خون نہیں چوستے۔وہ کبھی غفلت میں تم پر وار نہیں کرے گا اب تم ہی نہ جاگنا چاہو تو وہ چوکے گا بھی نہیں۔اور پھر اگر مارنا ہی ہے تو تمہیں اتنی قربانی تو دینی ہی ہوگی۔تمہارا ناپاک خون اس کے اندر جاتے ہی اس کی ساری توانائی سلب کرلے گا اور اس کی تیزی وطراری ختم ہو جائے گی پھر تم اسے بہت آسانی سے مارلوگے''

اور ہوتا وہی ہے صبح بیدار ہو کر جب وہ مچھر دانی کے اندر دیکھتا ہے تو وہ مچھر اس کا خون پی کر کافی بڑا لگ رہا ہے اور کاہل اتنا ہو گیا ہے ایک جگہ سے اڑ کر دوسری جگہ جانے میں بھی کاہلی لگتی ہے پھر وہ بڑی آسانی سے اسے مار لیتا ہے۔اس پر اپنی فتح

مندی کا نشہ چھا جاتا ہے پھر باہر کے مچھر اس پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ اس کی جھنجھلاہٹ پر وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ اپنی ہتھیلیوں کو دیکھے پھر قہقہے کا راز منکشف ہو جائے گا۔ وہ جب اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ اس کے اپنے ہی خون سے رنگے پڑے تھے۔

یہاں کہانی ختم تو ہو جاتی ہے لیکن اگر آپ اس کے بین السطور میں جائیں اور یہ غور کریں کہ اس کا نام خودکشی کیوں ہے۔ یہ خودکشی مچھر کی ہے تو پھر اس کے ہاتھ میں اس کا ہی خون کہاں سے آیا مچھر کو تو خون ہوتا نہیں اس کے ہاتھ میں مچھر کی بجائے دراصل وہی خون ہے جو رات میں پھر سے چوسا تھا۔ دراصل نورؔی بہت چالاک افسانہ نگار ہیں وہ واقعہ تو بالکل سامنے کا لاتے ہیں اور اسی سے ایک غیر معمولی بات پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ کہانی مچھر اور انسان کی نہیں ہے۔ مچھر دراصل استعارہ ہے انسان کے ضمیر کا اور جس دن انسان اپنے ضمیر کا خون کر دیتا ہے دراصل اس دن وہ خودکشی بھی کرتا ہے کیونکہ ضمیر کے بغیر انسان کا وجود ہی بے معنی ہے۔

''اور پھر ایسا ہوا'' نورؔی کی ایک ایسی کہانی ہے جسے انہوں نے منشی پریم چند کے مشہور کردار شیخ جمن اور الگو چودھری سے معذرت کے ساتھ تحریر کی ہے۔ ان کی اس کہانی کے کردار بھی شیخ جمن اور الگو چودھری ہیں۔

پریم چند کی کہانی ''پنچایت'' میں شیخ جمن اور الگو چودھری اہم کردار ہیں۔ دونوں ہی باعزت اور سماج میں اہم مقام والے ہیں۔ دونوں کے درمیان پنچایت کے فیصلے کو لیکر ہی ان بن ہوتی ہے اور پھر دوسری پنچایت کے فیصلے سے غلط فہمی بھی دور ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں پنچ کو پرمیشور کہا جاتا ہے دراصل وہ پنچ پرمیشور ہی کہلاتے تھے اور اس زمانے میں اس بات پر یقین کیا جاتا تھا کہ پنچ کا فیصلہ دراصل پرمیشور کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یعنی جو پنچ چاہے اسی پر پرمیشور کی مہر لگتی ہے۔

اب آیئے نورؔی کی کہانی دیکھیں۔ یہاں شیخ جمن ایک اڑیل اور بدمعاش قسم کا زمین دار ہے۔ ظالم بھی ہے اور بدکردار بھی۔ الگو چودھری بھی اسی گاؤں کا پاسی ہے اور چوری ڈکیتی بھی کرتا ہے دونوں کے درمیان دانت کاٹی دوستی ہے اور ایک دوسرے کے آڑے وقت میں وہ دونوں کام آتے رہے ہیں۔

ایک بار جب الگو چودھری تاڑ کے پیڑ پر تاڑی نکالنے چڑھتا ہے تو ایک گھمن سانپ اس کی پگڑی پر پھن کاڑھے بیٹھ جاتا ہے جب اسے اس کی جانکاری ہوتی ہے تو وہ بت بن جاتا ہے۔ شیخ جمن کو خبر ہوتی ہے وہ بے بس۔ پھر ان کی رائفل آتی ہے اور اسی جگہ گاؤں کی پنچایت بیٹھتی ہے کہ شیخ جمن اپنی رائفل کی مدد سے الگو کی جان بچائیں گے لیکن شیخ جمن پنچوں سے یہ بھی تحریر کرواتے ہیں کہ اگر سانپ کا پھن اڑانے کے چکر میں گولی الگو کے سر میں لگ جائے تو وہ اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ الگو کے خاندان والے بھی اس پر انگوٹھا لگاتے ہیں۔

شیخ جمن کا نشانہ اچوک ہے۔ رائفل کی گولی سانپ کے پھن کو اڑا دیتی ہے الگو پیڑ سے اتر کر زمین پر کودتا ہے اور شیخ جمن کے گلے لگ جاتا ہے پھر تھوڑی دیر بعد اس کا جسم نیلا ہونے لگتا ہے اور وہ لہرا کر زمین پر گر جاتا ہے۔ بعد میں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سانپ کا پھن پیڑ کے نیچے ہی گرا تھا جس پر الگو انجانے میں کود گیا۔ اس طرح سانپ کے زہر سے اس کی جان چلی گئی۔

کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ دیکھنے میں یہ ایک تجسس بھری کہانی ہے۔ انجام بھی چونکانے والا ہے لیکن اگر یہ ایک عام کہانی ہے تو پھر پریم چند کے کردار سے معذرت کی ضرورت کیوں آ پڑی یا پھر نورؔی نے اسی کردار کو لے کر کہانی کیوں لکھی؟

یہی ہے اصل کہانی کا راز۔ یہاں بھی کہانی دراصل بین السطور میں پوشیدہ ہے دراصل نورؔی نے دونوں کے اخلاقی بدلاؤ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ کل کے

کردار سے ہم واقف ہیں لیکن وہی کردار آج کے زمانے میں کیسے ہیں؟ زمانے کی دوری اخلاقی زوال کی الگ داستان بیان کرتی ہے۔ آج اخلاقی قدریں کس طرح پامال ہوئیں ہیں اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔

اخلاقی زوال کی انتہا یہ ہے کہ اب پنچ پرمیشور نہیں رہے۔ اب پنچ کے فیصلے پر پرمیشور کی مہر نہیں لگتی۔ پنچ کا فیصلہ تو یہ ہے کہ شیخ جمن سانپ کے زہر سے الگو کو ہلاک ہونے سے بچائیں گے لیکن پرمیشور کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اسی سانپ کے زہر سے الگو کی جان جائے گی۔

نورؔی نے اس کہانی کے ذریعہ دراصل اس بات کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقدار کی پامالی کا نتیجہ ہے کہ پرمیشور، پنچوں کے فیصلہ پر اپنی مہر نہیں لگاتا اور آج کے پنچ پنچ پرمیشور کہلانے کے بھی حقدار نہیں رہے۔

اس طرح آپ نورؔی کی کسی بھی کہانی کو لے لیں ان کی کہانی اکہری نہیں ہوتی ہر کہانی کے اندر ایک اور کہانی پوشیدہ ہوتی ہے جسے وہ تحریر نہیں کرتے اسے تو قاری کو خود ہی اپنے انداز میں لکھنی ہوتی ہے۔ آپ ان کی کہانیوں کو کئی ''ڈائمنشن میں پھیلا سکتے ہیں۔

پرانے اقدار کی پامالی سے نورؔی بہت کڑھتے ہیں وہ اسے آج بھی سنبھال کر رکھنے کے حق میں ہیں۔ جنریشن گیپ آج کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ان کی ایک بہت مختصر کہانی ہے'' کائیں کائیں'' اس کہانی میں جنریشن گیپ کو بہت اچھوتے انداز میں دکھایا گیا ہے۔ اس کہانی کو'' کتھا'' دہلی والوں نے اردو کی کچھ بہترین کہانیوں کے زمرے میں، انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔

''لمبی ریس کا گھوڑا'' نورؔی کی ایک بے حد تلخ کہانی ہے۔ آج انسان دنیا کے پیچھے بے تحاشا بھاگ رہا ہے۔ ترقی پانے کے لئے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا

ہے۔اس کہانی میں ایک ایسا کردار ہے جس کا ماننا یہ ہے کہ جس کے پاس خوبصورت بیوی ہو وہ دنیا کی کسی بھی بلندی کو سر کرسکتا ہے لیکن بیوی اس کی ترقی کا راستہ ہموار کرتے کرتے تھک جاتی ہے اور تنگ آکر اس کا گھر چھوڑ دیتی ہے۔ پھر اس شخص کی کمینگی کس انتہا تک پہنچتی ہے اسے پڑھ کر قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میں کہانیوں پر صرف طائرانہ نگاہ ڈال رہا ہوں۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے اس لئے صرف اشارے کرتا جا رہا ہوں۔

نورؔی کی ایک کہانی ''بند آنکھوں کا سفر'' ہے جو دیکھنے میں ایک رومانی کہانی لگتی ہے لیکن دراصل یہ Gandhian thought پر مبنی کہانی ہے۔ کمال یہ ہے کہ پوری کہانی میں لفظ گاندھی نہیں ہے۔ کہانی کا یہ پارہ گراف دیکھئے:

''اب میں مکمل اطمینان سے مووِنگ چیئر پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اب ڈسٹرب کئے جانے کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ کہانی مکمل کرنے کا نشہ مجھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ میں ایک سکون بھری انگڑائی لیتے ہوئے کمرے کی در و دیوار پر نظر ڈالتا ہوں۔ سامنے وزیراعظم کی تصویر ہے۔ دائیں ان کی مرحومہ ماں کی ہے بائیں ان کے نانا کی ہے اور میرے پیچھے کس کی تصویر ہے؟ ان کے دادا کی ہوگی۔ مگر نہیں شاید والد کی ہے۔ نہیں نہیں وہ بھی نہیں ہے۔ تو پھر کس کی ہے؟ تصویر تو ضرور ہے یہ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں مگر کس کی ہے؟ دماغ پر بہت زور ڈالتا ہوں مگر مایوس رہتا ہوں۔

کاش ہمارے پیچھے بھی آنکھ ہوتی تو کتنا آسان ہوتا کم از کم دماغ پر زور ڈالے بغیر ہی ہم بہت کچھ کہہ سکتے تھے۔ آسانی

سے بتا سکتے تھے کہ پیچھے کی تصویر کس کی ہے مگر پیچھے تو آنکھ نہیں
ہے اس لئے ایسا سوچنے سے فائدہ۔؟''

اس میں ایک جانب سیاست میں نسل واد کی جانب اشارہ ہے تو دوسری جانب یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ پیچھے کی جانب جو تصویر ہے اسے اس لئے نہیں دیکھا جا سکتا کہ پیچھے آنکھ نہیں ہے اگر پیچھے دیکھنا ضروری ہوتا تو ایک آنکھ وہاں بھی ہوتی۔

یہ سب کو معلوم ہے سرکاری دفاتر میں صاحب کی کرسی کی پشت پر گاندھی جی کی تصویر ہوتی ہے اور زیادہ تر لوگ اسے پس پشت ڈال کر ان کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

کہانی کے آخری پیراگراف میں دونوں زندگی کی جانب ایک ساتھ دوڑتے ہیں لیکن لڑکی تیز دوڑ گئی۔ نیز دوڑنا بھی استعارہ ہے ساتھ چھوڑنے کا۔ وہ سمندر کے کنارے رہ گیا وہ پیچھے الٹ کر دیکھ نہیں سکتا تھا کہ وہاں ایک تصویر تھی جسے دیکھ لیتا تو کون جانے امر ہو جاتا یا پتھر کے بت میں تبدیل ہو جاتا۔

نورؔی کی کسی بھی کہانی کے باطن میں اتر جایئے آپ وہاں ایک دوسری ہی کہانی پائیں گے جو بظاہر مکمل ہوئی نہیں ہوتی اسے آپ کو لکھنی ہوتی ہے۔

''چھت پر ٹھہری دھوپ'' ایک بے حد خوبصورت کہانی ہے۔ یہ دراصل جذبے کی زبان میں لکھی ہوئی کہانی ہے۔ اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے ایک رومانی کہانی جسے لکھنے میں فلیش بیک کا بے حد خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔ جا بہ جا ایسے پنچز آتے ہیں آدمی تحیر میں کھو جاتا ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر ہر قاری اپنے دل میں ایک عجیب سی گدگدی محسوس کرتا ہے۔

نورؔی کی کہانیوں کے کلائمکس پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان کی کہانی کا کلائمکس دھماکے دار ہوتا ہے قاری کے شان و گمان میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ ایسا کلائمکس

ہوسکتا ہے۔کلائمکس کے بعد وہ ایک جملہ بھی فاضل نہیں لکھتے۔

نوریؔ کے افسانوں کی زبان بالکل صاف ستھری ہوتی ہے۔ ان کی نثر خوبصورت ہوتی ہے اور وہ لفظوں کا خلاقانہ استعمال کرتے ہیں۔ جذبات نگاری مشکل چیز ہے اور اس مشکل مرحلے کو انہوں نے آسانی سے طے کیا ہے۔ان کی کہانی سیدھے دل تک پہنچتی ہے اور دل کے اندر ایک ایسے منطقہ کو روشن کر دیتی ہے جس منطقہ سے بہت سے دل نا آشنا ہیں۔

نوریؔ اپنے کرداروں پر حاوی نہیں ہوتے اور نہ ہی اپنی زبان ان کے منہ میں ڈالتے ہیں ان کے کردار بالکل فطری انداز میں آگے بڑھتے ہیں۔ان کی کہانی کی بنت غضب کی ہوتی ہے۔سانچہ بالکل کسا ہوا کوئی جھول نہیں۔وہ کہانی برسوں سوچتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی کہانی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں لکھی۔ہاں کہانی لکھتے وقت انہیں مکمل تنہائی درکار ہوتی ہے۔وہ لگاتار لکھتے رہتے ہیں جب تک کلائمکس نہ آجائے۔

نوریؔ کا ذہن تنقیدی بھی ہے۔فکشن پر جارحانہ تنقید کے لئے وہ مشہور رہے ہیں۔''مباحثہ''میں ان کے جو مضامین آئے اس نے فکشن کی تنقید کا ایک الگ پیمانہ ہی طے کر دیا ہے چونکہ ان کا ذہن تنقیدی ہے اس لئے ان کی اپنی کہانیاں بھی ان کی نگاہ میں رہتی ہیں۔وہ لکھنے سے قبل اور بعد میں بھی اس پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اس لئے عام طور پر ان کے یہاں جھول نہیں ہوتا۔

کسی فنکار کی پہچان کا تعین اس کے فن سے کیا جاتا ہے۔مشتاق احمد نوریؔ کی مختلف کہانیوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے ان کی شناخت کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ نوریؔ کتھا نگر کا ایک ایسا باسی ہے جو اپنی راہ آپ بناتا ہے وہ دوسروں کے بنائے راستے پر نہیں چلتا۔

☆☆

کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی کی کوشش
کرے''۔(انتخاب مضامینِ سرسید:ص۔۸۹۔۸۸)

اس اقتباس میں ''ہم وطنو'' اور ''قوم کے بچوں'' صرف مسلمانوں کے لئے نہیں کہا گیا ہے۔مگر کیا کیجئے جب ذہن کسی تعصب وتحفظ کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی سوچ کا دائرہ بھی محدود ہو جاتا ہے اور ویسے ہی محدود ذہنیت کے لوگ سرسید جیسے رہنمائے قوم کے افکار واعمال کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر وقت انصاف پسند ہوتا ہے وہ کسی ناانصافی کو کب قبول کرتا ہے۔آج ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے بڑے سے بڑے دانشور اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر سرسید اس وقت ملک میں تعلیمی وسماجی تحریک کا آغاز نہیں کرتے تو آج ہندوستان تعلیمی شعبے میں سو سال اور پیچھے ہوتا۔

سرسید کے تصورِ تعلیم پر جب کبھی گفتگو ہوتی ہے تو بعض مبصرین یہ کہتے ہیں کہ سرسید کی تحریک تعلیمِ نسواں کی روح سے عاری نظر آتی ہے۔میرے خیال میں اس طرح کی رائے قائم کر لینا سرسید کی مکمل تعلیمی وسماجی تحریک کا سرسری مطالعہ اور اس وقت کے ہندوستان کے سماجی وسیاسی حالات، مذہبی معاملات ومسائل اور معاشرتی حقائق سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔اگر سرسید کی اصلاحی وتعلیمی تحریک کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود عیاں ہو جائے گی کہ سرسید کا ماننا تھا کہ عورت کی اصلاح اور تعلیم کے بغیر نہ گھر کا نظام درست ہو سکتا ہے اور نہ ہی انسانی معاشرے کا توازن برقرار رہ سکتا ہے۔ہاں! یہ سچ ہے کہ سرسید نے لڑکیوں کی تعلیم کے مقابلے لڑکوں کی تعلیم کو اولیت دی اور ایسا انہوں نے کیوں کر کیا اس کی وضاحت بھی کی تھی۔''خاتونانِ پنجاب'' کے استقبالیہ میں انہوں نے اپنا موقف یوں بیان کیا تھا:

''میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اسے تم یہ نہ
سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں۔بلکہ میرا یقین

نئے امکانات کا ناول نگار۔اچاریہ شوکت خلیل
(''اگر تم لوٹ آتے'' کی روشنی میں)

اچاریہ شوکت خلیل کا نام شاید ان لوگوں کے لئے اجنبی ہو، جنہوں نے اپنے مطالعے کو نصابی کتابوں تک محدود رکھا ہے۔لیکن جن لوگوں نے علامہ اقبال کے اس ابدی مصرعہ ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' پر عمل کرتے ہوئے نصابوں کی دنیا سے باہر نکل کر ادھر ادھر بھی دیکھا ہے تو وہ اچاریہ خلیل کے نام سے نہ صرف آشنا ہوں گے بلکہ ان کی دھاردار نثر پر فریفتہ بھی ہوں گے۔خلیل دنیائے ادب میں ایک صحافی اور افسانہ نگار کی حیثیت سے 60ء کی دہائی میں ہی اپنی مستحکم شناخت بنا چکے تھے لیکن انہوں نے خود کو کبھی کسی گروہ میں شامل نہیں کیا اس لئے انہیں وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔ورنہ ان کے افسانے ''پُل''، ''کل کے بعد''، ''پیارونہ'' اور ''یوسف کوچوان کا گھوڑا'' نہ صرف خلیل کے شاہکار ہیں بلکہ اردو کے چند اچھے افسانوں میں شامل کئے جانے کے قابل ہیں۔خلیل نے گو کم افسانے لکھے لیکن جو لکھے وہ تکنک کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔نت نئے تجربات پر مبنی تنوع ان کے افسانوں کی تکنیک کی اساسی صفت ہے۔

مختصر یہ کہ ''اگر تم لوٹ آتے''، خلیل کا ایک قصباتی ناول ہے ریاست بہار کے متھلانچل کے عوام کی زندگی کی جدوجہد اور سیاسی کشمکش اور سماجی

تصادم کے موضوع پر مبنی یہ ناول اردو میں قصباتی ناول نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قصباتی ناول کسی خاص علاقے کی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔قصباتی ناول میں اس علاقے کی دیہی زندگی، رسم ورواج، پرب وتہوار اور بول چال میں استعمال ہونے والے کچھ خاص الفاظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن اس کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کہانی کسی خاص علاقے کی ہونے کے باوجود اس میں آفاقیت ہوتی ہے۔اس کی مثال کچھ یوں دی جاسکتی ہے کہ قصباتی ناول کی کہانی ایک بوند تیل کی مانند ہے اور اگر اس ایک بوند تیل کو ایک بڑے تالاب میں ڈال دیں تو اس ایک بوند کا وجود نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ وہ پھیل کر پورے تالاب میں اپنے وجود کا احساس بھی کراتا ہے۔واضح ہو کہ عالمی ادب میں قصباتی ادب کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔انگریزی ناول نگار تھامس ہارڈی نے قصباتی ناول کو بسکیس ناول کے ذریعہ متعارف کرایا تھا۔مشرقی ادب میں بھی قصباتی ادب کا چلن عام رہا ہے بالخصوص ہندی میں قصبائیت (آنچلکیتا) پر خاص توجہ دی جاتی رہی ہے۔ہندی میں اچاریہ شیو پوجن سہائے کا ناول ''دیہاتی دنیا''فنیشور ناتھ رینو کا ''میلا آنچل'' اور ناگ ارجن کا ''بلچنما'' کو سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے۔اردو میں پریم چند نے قصباتی ادب کو نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ اس کی ادبی اہمیت بھی تسلیم کروائی۔لیکن سچائی یہ ہے کہ آج تک اردو میں ''میلا آنچل'' اور ''بلچنما'' جیسا قصباتی ناول سامنے نہیں آیا۔مقامِ شکر ہے کہ خلیل نے ''اگر تم لوٹ آتے'' لکھ کر اردو میں قصباتیت کو مستحکم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔واضح ہو کہ خلیل کا یہ ناول قصباتی ضرور ہے لیکن اس میں گاؤں کی پوری دھڑکنیں قید ہیں۔گاندھی جی نے ہندوستان کو گاؤں کا دیس کہا تھا اور مارکس نے گاؤں کے دیہی معاشرے کو ندی کا جزیرہ قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اپنے غیر آباد ہونے کے باوجود بیشتر جاگیردار اور حاکم انہیں گاؤں سے اپنا معاش حاصل کرتے

رہے ہیں۔چونکہ خلیل کا تعلق گاؤں سے رہا ہے۔انہوں نے اپنی زندگی کے اصول وطریقے گاؤں سے حاصل کئے ہیں۔اس لئے ان کے یہاں گاؤں سے گہری جذباتی وابستگی جھلکتی ہے۔مگر خلیل نے ہندوستانی گاؤں کی تلخ سچائیوں کو پیش کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خلیؔل کا یہ ناول قصباتی ہو کر بھی مقامی نہیں رہ جاتا۔خلیل نے معاشرتی اور سماجی انصاف کے نام پر گاؤں کی پرامن اور خوش گوار زندگی میں کس کس طرح سے زہر گھولنے کا کام کیا جارہا ہے۔اس کا پردہ فاش کیا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کا اجگر کس طرح اپنا پھن پھیلائے ہوا ہے اس کی بھی نشاندہی کی ہے۔خلیل نے اس ناول کے ذریعہ اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ گاؤں کے معصوم لوگ آزادی کے 60 سال بعد بھی غلامی کی زندگی جی رہے ہیں۔گاؤں کی اس بد حالی کے لئے انہوں نے کسی خاص سیاسی پارٹی کو نہیں بلکہ تمام سیاسی جماعتوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور ایک نئے انقلاب کی ضرورت پر زور دیا ہے۔خلیل کا ماننا ہے کہ جب تک گاؤں کی زندگی میں انقلاب نہیں آتا۔ان کی عوامی بنیاد نہیں بدلتی،اس وقت تک ملک کی تصویر اور تقدیر نہیں بدل سکتی۔انہوں نے اس ناول میں صرف عوامی نظام کی ہی تنقیدی تصویر کشی نہیں کی ہے بلکہ اس میں مکمل عوامی زندگی کے تصور کے نقوش واضح ہوئے ہیں۔کونریڈ نے لکھا ہے کہ ''سچائی کا رومانی روپ اپنے آپ میں ایک لغت ہو سکتا ہے لیکن جب وہ کسی انفرادی نظام یا کارکردگی کے ذریعے اظہار پاتی ہے اور انسانی حکومت کے بے رحم عناصر کی پہچان بن جاتی ہے تب مکمل انسانی جذبات کی شکل میں عالمی نقطہ نظر بن کر زندگی کی رنگارنگی کو نمایاں کرنے لگتی ہے''۔خلیل کے اس ناول میں سچائی کے ایسے ہی رومانی جذبات ہیں لیکن خلیل کے تخلیقی عمل کا ذریعہ محض انفرادی کرب نہیں ہے بلکہ عام لوگوں کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش ہے۔اس لئے خلیل کے ناول میں ایک ایسا ہندوستان دکھائی دیتا ہے جس میں فرقہ پرستی ،نسل پرستی

،علاقائی تعصب،سرمایہ داروں کے ظلم وستم، سیاستدانوں کے مکروفریب ،مذہبی ٹھیکیداروں کے استحصال اور مجبوری اور بے بسی کے ماحول میں سانس لیتا انسان نظر آتا ہے۔اس لئے جب ہم ہندوستان کی سیاسی اور سماجی اقدار کے تناظر میں اس ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔اس میں افراداور معاشرہ کی باہمی آویزش کی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہےاور کردار اپنی انفرادی اور شخصی حیثیت کے ساتھ ساتھ اپنے طبقے اور سماجی منصب کے نمائندہ بن گئے ہیں،بلاشبہ ناول کے کردار محض خیالی نہیں ہیں بلکہ وہ سب کے سب آس پاس کے جیتے جاگتے لوگ ہیں۔ان سب کی زندگیوں پر ناکامیوں اور مایوسیوں کے بادل منڈلاتے ہیں جس کی اذیت ناک تفصیلات ایک ایسی دلچسپ اور کہیں کہیں غیرادبی زبان میں بیان کی گئی ہیں جو نچلے متوسط طبقے کی زبان ہےاور براہِ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہے۔

خلیؔل نے اس ناول میں تحریکِ آزادی اور حصولِ آزادی کے بعد تقسیم وطن کے المناک واقعات کو پیش کیا ہے بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> ''شوکت خلیل کے اس ناول میں ہندوستان کی تاریخ کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے اس المیہ ناٹک کو کچھ ایسے کرداروں کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو ان کے جانے پہچانے ہیں اور ناول میں جن کی شناخت اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہوتی نظر آتی ہے''۔

اس ناول میں کرداروں کی بھرمار ہے۔لیکن کوئی بھی کردار محض بھرتی کا معلوم نہیں ہوتا۔تمام کردار اپنی موجودگی کا احساس کراتے ہیں لیکن ان سب میں شریف احمد خاں، دیوِنندن سنگھ،مارک ٹیلر،مسز روز ٹیلر، ظریف خاں، آصف علی خاں،اورمستان صاحب جیسے کرداروں کو قاری بھلا نہیں پاتا۔خصوصاً شریف احمد خاں

اور روز ٹیلر کا کردار قاری کے ذہن پر گہرا نقش بناتا ہے۔ شریف احمد خاں انگریزی حکومت کا ملازم ہے۔ لیکن اس کا دل جذبہ حب الوطنی سے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور وہ انگریز افسر مارک ٹیلر سے نفرت کرتا ہے لیکن جب مسز روز ٹیلر اس کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہے تو شریف خاں بھی اس کو اپنے دل میں نہ صرف جگہ دیتا ہے بلکہ اس کے لئے جینے کا سہارا بن جاتا ہے۔ اگر چہ ناول میں محبت کی خوشگوار فضا بہت دیر تک قائم نہیں رہتی اور مسز روز کی موت کے بعد ناول میں ایک نیا رخ پیدا ہو جاتا ہے۔ ناول میں ایک طرف دیو نندن سنگھ، باسو دیون اور شریف احمد کا کردار انسانی رشتوں کو استحکام بخشنے کی علامت ہے تو دوسری طرف ظفر کامران، چینا بابو، بکاؤ منڈل، پروفیسر شفیق الرحمٰن، وجاہت علی خاں اور دکھ موچن غیتا جیسے کرداروں کی ابن الوقتی اور مطلب پرستی زوالِ انسانیت کی مثال ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ناول کا مرکزی موضوع آزادی کے بعد کا ہندوستان ہے اور بقول ڈاکٹر قمر رئیس ''ہندوستانی مسلمانوں کا حالِ زار ہے ان کا تہذیبی سماجی اور سیاسی زوال ہے'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ ''خلیل نے متوسط درجے کے ہندوستانی سماج کا المیہ پیش کیا ہے'' جبکہ عبدالرافع کا کہنا ہے کہ ''یہ ناول جدوجہد آزادی، قبل آزادی کے ہندو مسلم اتحاد، اعلان آزادی اور اس کے بعد کے منظر نامہ سے تعلق رکھتا ہے، جس میں فرقہ وارانہ تشدد ہے، ہندو مسلم کشیدگی ہے۔ امتیازی سلوک ہے، بے روزگاری ہے، بھوک ہے، افلاس ہے، ناخواندگی ہے، مایوسی ہے، پسماندگی ہے، نفرت ہے، حقارت ہے، بددیانتی ہے، ضمیر فروشی ہے اور پھر ہجرت ہے۔''

مختصر یہ کہ خلیلؔ نے اس ناول میں ایک طرف متھلانچل کے دیہی علاقوں کے سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کو موضوع بنایا ہے اور اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ

قومی معاشی نظام سے ملک کے دیہی علاقوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو رہا ہے تو دوسری طرف انہوں نے آزادی کے بعد ہندوستان میں غیر متوازن سرکاری نظام اور مفاد پرست سیاست کی وجہ سے ملک میں کس طرح فرقہ پرست طاقتیں مستحکم ہوئیں ہیں اس کا پردہ فاش کیا ہے۔ بالخصوص مسلم قائد کی ابن الوقتی اور دوغلے کردار کو بے نقاب کیا ہے۔ خلیلؔ نے بابری مسجد کی شہادت اور گجرات فسادات کے بعد ہندوستان میں جو خوفناک ماحول پیدا ہوا ہے اس کے لئے صرف فرقہ پرست تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کو ہی ذمہ دار نہیں ٹھہراتے بلکہ مسلم قیادت کو بھی قصوروار ٹھہراتے ہیں کہ ان کی غلط سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے ہی ہندوستانی مسلمانوں کو یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔

ناول نگار نے شریف احمد خاں کے کنبہ کو بطور علامت پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ بدحالی اور پستی کی وجہ ہماری بے سمت سیاست رہی ہے۔ آصف علی خاں کے بیٹے عرفات خاں کا ملک سے ہجرت کرنا، ملک میں مسلمانوں کے اندر کے خوف وہراس کی ترجمانی کرتا ہے تو آصف علی خاں کا یہ کہنا کہ ''اچھا ہوتا اگر تم لوٹ آتے''۔ ان لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کی آواز ہے جو ہر طرح کے ظلم و جبر سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اپنے ملک میں ہی جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

خلیلؔ کا یہ ناول اپنے موضوع اور مستحکم پلاٹ کے ساتھ ساتھ فطری زبان کی دلکشی سے بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ اردو میں تاریخی واقعات پر مبنی اس طرح کا مکمل قصباتی ناول شائع ہی نہیں ہوا ہے۔ خلیل کی علاقائی زبان کو کچھ لوگوں نے سراہا ہے تو کچھ نے مقامی اسلوب پر اعتراض بھی کیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ناول میں مقامی الفاظ کے استعمال سے نہ صرف حسن پیدا ہوا ہے بلکہ اردو میں قصباتیت کی بنیاد مستحکم ہوئی ہے۔ علاقائی زبان کے الفاظ ادائے مطلب

میں کس طرح حسن پیدا کرتے ہیں اس کی مثال ناول کے اس اقتباس میں دیکھئے :

''مینے کا بچہ سرولی رے، دوگو جامن گرادے، اور واقعی جب وہ اوپر پتھار کے پتھار جامن گراتی تو ان بچوں کے ساتھ ساتھ اغل بغل گھات لگا کر کھڑی جوان چھوکڑیاں بھی ان پر جھپٹ پڑتیں۔ اور پھر ان سب میں وہ پڑکا پٹکی اور چھینا چھپٹی مچتی کہ کبھی کسی کی اک چھنی ساڑی کھل کر گر پڑتی اور کبھی پھٹے شکوکے سے ''چرڑ'' کی آواز کے ساتھ......!

گے دیوّ گے دیوّ، تنی بڑکے میاں پسیری بھر کا......!

ایہہ باپ ہو باپ، چاٹ لے گٹھلی نون لگا کے...!

مختصر یہ کہ ''اگر تم لوٹ آتے'' موضوع اور کہانی سے قطع نظر تاریخی حقائق دلچسپ واقعات، رنگین علاقائی زبان اور فنکاری کے لحاظ سے ایک اہم ناول ہے۔ اردو ناول نگاری میں یہ قصباتی ناول کی نادر مثال ہے بالخصوص اچاریہ شوکت خلیل کا مخاطبانہ طرز اظہار ان کی منفرد شناخت کا ضامن ہے۔ اگر چہ اس میں ایک خاص علاقے کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے لیکن حقیقتاً یہ پورے ملک کی کہانی ہے۔ اس میں ماضی کا کرب ہے۔ حال کا اضطراب ہے اور مستقبل کی فکر پرسیاں بھی ہے۔ مجموعی طور پر اچاریہ خلیل کا یہ ناول موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے عصری اردو ناول نگاری میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔

☆☆☆

EHTESAB-E-FIKR-O-NAZAR

by

Dr. Mushtaque Ahmad

اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کے سامنے یہ ایک بڑا چیلنج ھے کہ آخر اردوزبان کس طرح بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آھنگی پیدا کرے۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبے میں انقلاب برپا ھوگیا ھے اور جس کی شدت دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی ھے۔ اب چوں کہ دنیا ایک بازار بن گئی ھے اس لئے ہر ایک میدان میں مقابلہ بڑھ گیا ھے اور جس کی وجہ سے روایتی زندگی کا توازن بھی یکسر بدل گیا ھے۔ ادب میں بھی کچھ اس طرح کی تبدیلی رونما ھو رہی ھے۔ ظاھر ھے جب زندگی جینے کے طریقے بدل رھے ھیں تو زندگی کاآئینہ یعنی ادب میں بھی ھماری تصویر بدلے گی اورضرور بدلے گی کہ یہ ایک فطری عمل ھے۔

☆ **ڈاکٹر مشتاق احمد**

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-407-0

₹ 200.00

ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لئے کرتا ہوں، لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے ہیں''۔

(سر سید احمد خاں کا سفر نامۂ پنجاب۔ سید اقبال علی، ص:۱۴۴)

پھر ایک دوسری جگہ تعلیمِ نسواں کی اہمیت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''کوئی دنیا کی تاریخ اس وقت تک نہیں مل سکی کہ جس خاندان کے مردوں نے تعلیم پائی ہو، مردوں کے اخلاق درست ہو گئے ہوں، مردوں نے علم و فضل حاصل کر لئے ہوں اور عورتیں تعلیم سے محروم رہی ہوں۔ ہماری منشا یہی ہے کہ یہ تعلیم جو ہم دلا رہے ہیں لڑکوں کی نہیں ہے بلکہ لڑکیوں کی ہے جن کے وہ باپ ہوں گے۔ ہم کو ولی ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، پیشنگوئی نہیں کر سکتے بلکہ ہم کو پچھلے واقعات دیکھ کر نصیحت لینی چاہئے۔ اس وقت ہم تمام یوروپ کی اور تعلیم یافتہ ملکوں کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں، عورتیں لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہو عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں''۔

(خطباتِ سر سید۔ جلد دوم، مرتب اسمٰعیل پانی پتی۔ ص:۲۷)

اس دورِ عالمیت (گلوبلائزیشن) میں اس بات کی پُر زور وکالت کی جا رہی ہے کہ آج طلباء و طالبات کو ایسی تعلیم دی جانی چاہئے جو روزگار دلانے میں معاون ہو سکے۔ یعنی عصری تقاضوں کو پورا کرنے والی جدید تکنیکی اور ووکیشنل تعلیم کی اہمیت بتائی جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ہم عصری تقاضوں کو پورا کرنے والی تعلیم سے اپنے بچوں کو آراستہ نہیں کریں گے تو ان کے لئے روزگار کے نئے راستے

ہموار نہیں ہو سکیں گے۔ سر سید احمد نے بھی تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا کہ اگر ہم صرف ڈگری حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرتے ہیں تو بے سود ہے۔ انہوں نے ایسی تعلیم کی وکالت کی تھی جو حسبِ احتیاجِ وقت ہو یعنی عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہو۔ انہوں نے کہا تھا کہ:

> ''جو تعلیم حسبِ احتیاجِ وقت نہ ہو، وہ غیر مفید ہوتی ہے اور جیسا کہ ایک عقل مند کا قول ہے کہ اگر حسبِ احتیاج لوگوں کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل، اور پھر ذلیل و خوار اور پھر چور و بدمعاش ہو جاتے ہیں'' (مقالاتِ سر سید حصہ ہشتم۔ ص:۲۹)

جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ گلوبلائزیشن نے پوری دنیا کو ایک بازار بنا دیا ہے۔ آج دنیا کا ہر ایک ملک دوسرے ملک میں بازار کی تلاش میں ہے۔ یہ عالمی بازار کا تصور گذشتہ دو دہائی کے اقتصادی انقلابات کی دین ہے۔ لیکن دانشور سر سید نے آج سے 135 سال قبل ہی اس عالمیت کا تصور پیش کیا تھا:

> ''سمندر کے اندر ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے، غیر ملکوں سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہم کو چاہئے کہ دوسرے ملک میں آرتھ اور کمپنیاں قائم کریں۔ جس سے اعلیٰ درجے کے تاجر ہوں، ملک کی پیداوار، قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔ اس طریقے سے کہ اپنے ملک میں اپنے ہی بھائی کا روپیہ لے کر فائدہ اٹھاویں، ملک میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ روپئے کو کبھی اس تھیلی میں اور کبھی اس تھیلی میں ڈالنے سے روپیہ بڑھ نہیں جاتا۔ جب تک کہ باہر سے لا کر اس میں

روپیہ نہ ڈالا جائے ۔جب تم ایسا کرو گے اس وقت بے شک
جس طرح ہمارے ملک کا روپیہ دوسرے ملک میں جاتا ہے ہم
بھی دوسرے ملک کا روپیہ اپنے ملک میں کھینچ لاویں
گے''(مقالاتِ سرسید حصہ ہشتم۔ص:۱۳۱)

آج ہندوستان کے ماہرینِ زراعت اس مسئلہ پر اکثر فکر مندی کا اظہار کرتے ہیں کہ ملک میں زراعت کے لائق زمین کی کمی نہیں ہے لیکن پیداوار میں اضافہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ ہمارے سائنسداں کا کہنا ہے کہ ہم جدید ترین ٹکنالوجی کو اپنا کر زراعت کے طریقہ کار میں اصلاح کر سکتے ہیں اور اپنی پیداوار بڑھا سکتے ہیں۔ موجودہ مرکزی حکومت ''ہرت کرانتی'' پروگرام کے تحت زراعت کے قدیم طریقہ کار میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہی ہے۔ سرسید جنہیں ہم اور آپ صرف ایک سماجی مصلح اور سیاسی مفکر سمجھتے ہیں۔انہوں نے اس مسئلہ پر تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے غور و فکر کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ :

''یہ بات سچ ہے کہ ہندوستان کی زمین کثرتِ پیداواری ملکوں میں مشہور ہے لیکن اگر اس عمدہ زمین میں کاشت کاری قاعدے سے ہو تو اور زیادہ ترقی ممکن ہے۔ بہت سی اجناس ہندوستان کی پیداوار کی ایسی ہیں جو اور ملکوں کی اجناس کے مقابلے میں ناقص اور بری ہیں۔اگر یہاں کے کاشت کار علم فلاحت کی تمام شاخوں سے واقف ہوں تو بلا شبہ یہاں کی اجناس پیداوار بھی اور ملکوں کی اجناس پر سبقت لے جاوے ورنہ ان کی مثال تو ضرور ہو جاوے''

واضح ہو کہ یہ اقتباس ''سائنٹیفک سوسائٹی'' جس کی داغ بیل سرسید نے غازی پور میں 15/اگست 1863ء میں ڈالی تھی اس کے روئداد نمبر 6 سے ماخوذ ہے۔

سرسید نے اپنے دوست Smith Eldars کو ایک خط لندن بھیجا تھا اور اس میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ایک ایسی کتاب لکھوائی جائے جو زراعت کے جدید طریقوں پر مبنی ہو۔

سرسید کا ذکر ہو اور ان کی لسانی خدمات پر تبصرہ نہ ہو تو کہانی ادھوری رہ جائے گی۔ یوں تو زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو سرسید کے کارناموں سے اچھوتا ہو۔ لیکن انہوں نے اردو زبان وادب کو جو نیا آہنگ اور نیا عزم سفر بخشا اس کی مثال نہیں ملتی۔ سرسید نے اس اردو زبان کو صرف ادب، تاریخ اور مذہب کے مضامین تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے مکمل حیات کا آئینہ بنادیا۔ انہوں نے اپنے اردو مضامین کے ذریعے ہمیں مغرب کے افکار ونظریات سے آشنا کرایا۔ ''تہذیب الاخلاق'' نے نہ صرف اردو میں صحافت کی مستحکم بنیاد ڈالی بلکہ آنے والی صدی میں اردو صحافت کا جو معیار بلند ہوا وہ ''تہذیب الاخلاق'' کی دین ہے۔ انہوں نے اپنے اسلوب سے اردو نثر کی دنیا ہی نہیں بدل ڈالی بلکہ اردو شاعری کے جہانِ تاریک کو بھی منور کیا۔ اگر سرسید نے اردو شاعری کی طرف توجہ نہ کی ہوتی تو دنیائے ادب حالؔی کے ''مقدمہ شعروشاعری'' سے محروم رہ جاتی اور ظاہر ہے کہ اگر ''مقدمہ شعروشاعری'' نہ لکھی جاتی تو ممکن ہے کہ ہمارے شعراء اب بھی ''رگِ گل سے بلبل کے پَر باندھتے'' رہتے۔ انہوں نے اردو زبان کو آسان اور عام فہم بنانے کے لئے نہ صرف خود مختلف موضوعات پر مضامین لکھے بلکہ اپنے رفقاء کو بھی اس علمی فریضہ کو انجام دینے کے لئے تیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مذہب، سیاست، تاریخ، فلسفہ، علمِ کلام، تبصرہ اور تنقید وغیرہ کی زبان اتنی عام فہم ہوگئی کہ اب معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ان مضامین میں دلچسپی لینے لگا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بجا ہی لکھا ہے:

> ''ان کے فیضِ صحبت سے کتنے ہی سنگ ریزے افقِ علم پر آفتاب بن کر چمک اٹھے۔ ان میں ''آدم گری'' کا حوصلہ بھی تھا

اور ''شیشہ گری'' کی صلاحیت بھی۔''

غرض کہ سر سید نے اپنے افکار ونظریات کی روشنی سے انسانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جسے منور نہ کیا ہو۔ انیسویں صدی کا کوئی دوسرا مصلح ومفکر ان کے عرفان وآگہی اور دانشوری کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ آج پوری دنیا میں سر سید کی فکر کا سنجیدہ مطالعہ ہو رہا ہے اور اب سر سید صرف ہندوستانی قوموں کے رہنما ہی نہیں رہ گئے ہیں بلکہ پوری انسانیت کے خیر خواہ تسلیم کئے جاچکے ہیں۔ اس لئے سر سید کے افکار ونظریات کو کسی خاص عہد کے تناظر میں نہیں دیکھا جانا چاہئے۔ راقم الحروف نے جو دلائل پیش کئے ہیں اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سر سید کے سوڈیڑھ سو سال پہلے کے خیالات آج کے عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور آنے والی صدیوں میں بھی ان کے فکری سرمایے کی اہمیت ومعنویت برقرار رہے گی۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے ایک دہائی قبل اپنے ایک مضمون لکھا تھا:

''مسلمانانِ ہند کی گذشتہ سوا سو سال کی کتابِ زندگی کا کوئی ورق ایسا نہ ہوگا جس پر سر سید کے گہرے اثرات کی مہر ثبت نہ ہو۔ مذہب، سیاست، معاشرت، تہذیب وتمدن، تعلیم غرض زندگی کا کون سا میدان ہے جس کے بارے میں ہم گفتگو کریں اور اس کے ڈانڈے سر سید اور ان کی اصلاحی تحریک سے جا کر نہ مل جاتے ہوں۔''

(معمارِ قوم سر سید احمد خاں۔ تہذیب الاخلاق، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص:۲۲)

میری خواہش تھی کہ سر سید کے پیغامِ ابدی پر بالخصوص عصری معنویت کے حوالے سے کچھ اور گفتگو کروں لیکن طوالت اس کی اجازت نہیں دیتا۔ بس اپنی گفتگو شاعرِ عرفان وآگہی مرزا غالبؔ کے اس شعر پر ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

☆☆

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

EHTESAB-E-FIKR-O-NAZAR

by
Dr. Mushtaque Ahmad
Principal
Millat College, Darbhanga (Bihar)
Mob: 09431414586

Year of Edition 2014
ISBN 978-93-5073-407-0
Price Rs. 200/-

نام کتاب	احتسابِ فکر ونظر
مصنف	ڈاکٹر مشتاق احمد
سنِ اشاعت	۲۰۱۴ء
قیمت	۲۰۰ روپے
تعداد	پانچ سو
کمپوزنگ	افضل۔نایاب گرافکس، دربھنگہ(9905228544)
مطبع	عفیف پرنٹرس۔دہلی۔۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

سرسید احمد خاں: فکر ونظر کے چند پہلو

کسی عظیم شخصیت کے افکار ونظریات کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس عہد پر بھی نگاہ رکھی جائے کہ جس عہد کے وہ پروردہ ہیں۔ کسی بھی شخصیت کی تعمیر اور فکری استحکام میں تغیرِ زمانہ کا اہم کردار ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں جیسی نابغۂ روزگار شخصیت اوران کے افکار ونظریات پر گفتگو کرنے سے قبل ان کے عہد کے سیاسی، سماجی و معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ ان کے تصورِ حیات کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز سے 1857ء تک کے ہندوستان میں جو سیاسی وسماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ عہد کس قدر پامالیٔ اقدار، سماجی اور طبقاتی کشمکش کا تھا 1857ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ایک طرف ہندوستانیوں کے دلوں میں حب الوطنی کی چنگاری شعلہ کا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی تو دوسری طرف فاتح انگریزی حکومت نے اپنی بربریت کے شکنجے کو پہلے سے کہیں زیادہ کسنا شروع کر دیا تھا۔ نتیجتاً اب انگریزی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو دل دہلا دینے والی سزائیں دی جانے لگیں۔ آخری پنشن یافتہ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کے ساتھ کس طرح کا غیر انسانی سلوک اپنایا گیا اور ان کے خاندان کے چراغوں کو کس کس طرح

بجھایا گیا اس خونی داستان سے ہماری تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں اور یہی پُر آشوب عہد سر سید احمد خاں کی عملی زندگی اور فکر ونظر میں انقلاب کا زمانہ ہے۔ واضح ہو کہ سر سید احمد خاں انگریزی حکومت میں ملازم تھے اور انگریزوں سے انہیں قدرے قربت بھی تھی لیکن 1857ء کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ نازیبا اور غیر انسانی سلوک شروع کیا تو سر سید کا قوم پرست دل تڑپ اٹھا۔ لیکن سر سید ایک دانشور تھے وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے تھے کہ اس وقت انگریزوں کے خلاف سیدھی جنگ شروع نہیں کی جاسکتی کیوں کہ حالیہ جنگ میں ناکامی کے بعد ایک طرف ہندوستانیوں کا حوصلہ پست ہو چکا تھا تو دوسری طرف انگریز اپنی سیاسی چالوں سے ہندوستانیوں کے اتحاد کو بھی پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ایسے نازک حالات میں سر سید احمد جیسے نبّاض دانشور کے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ انگریزوں سے اپنے رشتوں کو نہ صرف برقرار رکھیں بلکہ اسے مزید استحکام بخشیں۔ لہذا انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت و بصارت کے سہارے شکست خوردہ مایوس وملول قوم کے لئے ملک میں ایک ایسی فضا تیار کرنے کی سوچی جس سے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں وہ بھی کم ہوں اور مسلمانوں کی گھٹن میں بھی کمی واقع ہو۔ انہیں مقاصد کے تحت انہوں نے ''اسباب بغاوت ہند'' اور ''تاریخ سرکشی بجنور'' لکھ کر انگریزوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ 1857ء کی بغاوت کے اسباب کیا تھے۔

واضح ہو کہ سر سید ہی کی طرح انگریزی حکومت کے ایک وفادار ہندوستانی مؤرخ غلام حسین طبا طبائی بھی 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے اسباب کی

وضاحت اپنی کتاب ''سیرۃ المتاخرین'' میں کر چکے تھے۔ طباطبائی نے لکھا تھا کہ:

''نئے حکمرانوں کا عوام سے کوئی رابطہ نہیں ہے، انہوں نے ہندوستانیوں کو تجارت سے محروم کر دیا۔ نئے حکمرانوں نے قدیم حکمرانوں کی فلاحی کاموں کے لئے دی جانے والی جاگیر کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔ ہندوستانیوں کو فوج میں ملازمتوں کے حصول کے اب وہ مواقع میسر نہیں ہیں جو ان کو پہلے حاصل تھے۔'' (ص:۸۴)

سرسید ایک ذہین انسان تھے۔ ان کا سیاسی، سماجی، مذہبی اور تاریخی شعور کتنا پختہ تھا اس کا بیّن ثبوت ان کی درجنوں تصانیف اور خطبات و مقالات ہیں۔ ان سب کی تفصیلات یہاں ممکن نہیں کہ خوف طوالت درپیش ہے۔ اگر چہ ان کی فکر کی جولانیاں ہمیشہ نئی راہ کی تلاش میں رہتی تھیں مگر 1857ء کے بعد انہوں نے اصلاحِ قوم کو ہی اپنا مقصدِ حیات قرار دے کر ایسے ایسے کارنامے انجام دئے ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ حالؔی نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ''حیاتِ جاوید'' کے دیباچے میں ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:

''اگر چہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولو العزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے براہِ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی

کے لئے درکار ہیں ہمارے لئے بے سود ہوگی ۔ البتہ سرسید کی
لائف ہمارے لئے ایک ایسی مثال ہے جس کی پیروی سے ممکن
ہے کہ ہماری قوم کی یہ کٹھن منزل جو تنگنائے دنیا میں ظاہراً اس کی
سب سے آخری منزل ہے آسانی کے ساتھ طئے ہوجائے''۔

بلا شبہ اگر اس پُر آشوب دور میں سرسید ہماری رہنمائی نہیں کرتے تو شاید ہندوستانی مسلمان پسماندگی کے اس دلدل سے باہر نہیں نکل پاتے جس میں اس وقت پھنسنا ان کا مقدر بن چکا تھا۔ سرسید نے نہ صرف مسلمانوں کی محرومیوں اور بدنصیبیوں کا مداوا تلاش کیا بلکہ ان کے اندر زندگی جینے کا حوصلہ بھی بخشا۔ انہوں نے مسلمانوں کو قومیت کے ایک نئے مفہوم سے آشنا کیا اور اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اب ہماری ترقی کی واحد کنجی تعلیم ہے اور تعلیم بھی روایتی نہیں بلکہ نئے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے والی تعلیم ہی ہماری تقدیر بدل سکتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اس بات کا احساس دلایا کہ برادرِ وطن کی زندگی اگر ہم سے قدرے بہتر ہے تو اس کی واحد وجہ تعلیم ہے۔ سند رہے کہ انہوں نے ایسا اس لئے کہا کہ وہ راجا رام موہن رائے، دیانند سرسوتی اور کیشب چندسین جیسے سماجی اور مذہبی رہنماؤں کی اصلاحی تحریکوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مسلمانوں کے مقابلے اگر ہمارے برادرِ وطن ترقی کے دور میں آگے نکل گئے ہیں تو اس کی واحد وجہ ان کی تعلیمی بیداری ہے۔ اس لئے سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان اس تعلیم سے آراستہ ہوں جو ان کی زندگی میں انقلاب پیدا کردے۔ انہوں نے مقصدِ تعلیم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے
کہ کس مسلمان نے بی۔اے یا ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرلی۔

میری خوشی قوم کوقوم بنانے کی ہے''۔

اوراسی طرح کا خیال اپنے مضمون ''رائے درباب تعلیم'' میں ظاہر کیا کہ:

''ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اوراس کی عقل اور ذہن میں جودت پیدا ہو۔تا کہ جوامور پیش آئے ان کے سمجھنے کی، برائی، بھلائی جاننے کی اورعجائب قدرت الٰہی پرفکر کرنے کی اس کو طاقت ہو۔ اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کونہایت صلاحیت سے انجام دے اورامورمعاد پرغورکرے''۔(مقالاتِ سرسید)

حیاتِ سرسید کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ 1857ء کے بعد ان کے غوروفکر کا محور ومرکز صرف اصلاحِ قوم اور تعلیم رہا ہے۔ غازی پور میں مدارس کا قیام، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، علی گڑھ میں مدرسہ اور پھرایم۔اے اوکالج کی داغ بیل، سائنٹفک سوسائٹی گزٹ کی اشاعت، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاداور ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراوغیرہم کا واحد مقصد قوم کو بیدار کرنا اورانہیں علم وہنر کے نئے مطالب ومفاہیم سے آگاہ کرنا تھا۔جیسا کہ خودسرسید نے ایم۔اے۔اوکالج کے بنیادی مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

''یہ ادارہ مسلمانانِ ہند کی تعلیم، تہذیب وثقافت اور دانشورانہ قیادت کا مرکز بن جائے۔ یہاں ایسے تربیت یافتہ ذہن تیار ہوں جوآئندہ ملک وقوم کے لئے سرمایۂ فلاح ثابت ہو''۔

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ جب سرسید نے اصلاحِ قوم کے لئے عملی اقدامات شروع کئے تو اوروں کی بات تو چھوڑیئے اپنوں نے بھی ان کی کس قدر مخالفت کی۔ان پر نہ جانے کتنے بے ہودہ الزامات لگائے گئے۔کسی نے ان کو

انگریزوں کا پٹھو کہا تو کسی نے دہریہ تک کہہ ڈالا۔ کسی نے ان کے نظریہ تعلیم کو اسلام مخالف قرار دیا تو کسی نے یہ افواہ پھیلائی کہ سرسید انگریزی تعلیم کے ذریعہ دینی تعلیم کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ حقیقت بالکل برعکس تھی کہ سرسید شروع تا آخر جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کے بھی علم بردار رہے۔ انہوں نے اپنے خطبات ومقالات میں ہمیشہ اس نکتے پر زور دیا کہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم حاصل کرنی چاہئے جو دین ودنیا دونوں کے لئے مفید ہو۔ انہوں نے کہا تھا کہ:

> ''پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ تعصب کو چھوڑ دیں اور بعد تحقیقات ومباحث کے سلسلہ تعلیم مسلمانوں کا ایسا قائم کریں جو ان کے دین ودنیا دونوں کے لئے مفید ہو''۔ (مقالاتِ سرسید۔ مرتب شیخ اسماعیل پانی پتی، لاہور، ۲۸/۸)

اور دوسری جگہ اس کی وضاحت یوں کی ہے:

> ''جو لوگ ہندوستان میں مسلمانوں کی عام تعلیم پر کوشش کرتے ہیں ان کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ عام تعلیم کا رواج کسی قوم کے زن ومرد میں بغیر شمولِ تعلیم مذہبی کے نہ ہوا ہے نہ ہوگا اور نہ دنیا میں کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی موجود ہے جس میں عام تعلیم کا رواج بلا شمول مذہبی تعلیم کے ہوا ہو۔''
>
> (مقالاتِ سرسید مرتب شیخ اسماعیل پانی پتی، لاہور، ۱۰۴/۸)

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ زبان کے تعلق سے بھی سرسید کی ذات کو نشانہ بنایا گیا اور انہیں انگریزی زبان کا دلدادہ قرار دیا گیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے فارسی، عربی اور اردو کے فروغ کے لئے نہ صرف خود کو وقف کر رکھا تھا بلکہ اپنے رفقاء کے ذریعہ اتنے کارنامے انجام دلوائے کہ اس کے ذکر کے بغیر تاریخِ ادب

اردو مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ ہاں! یہ حقیقت ہے کہ وہ انگریزی زبان کے مخالف نہیں تھے۔ان کا ماننا تھا کہ ذخیرۂ جدید علوم وفنون انگریزی زبان میں دستیاب ہیں اس لئے اس سے استفادہ کیا جانا چاہئے۔اس لئے انہوں نے سائنس وثقافت کے تعلق سے کئی انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ بھی کرایا۔لیکن وہ ہمیشہ اپنے اس قول پر قائم رہے کہ بچوں کو مادری زبان میں ہی تعلیم دی جانی چاہئے۔وہ اکثر یہ جملہ دہرایا کرتے تھے کہ: ''اگر ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہو تو ہمارے لئے اور ملک کی ترقی کے لئے زیادہ تر مفید ہے''۔اور مادری زبان کی اہمیت وافادیت کے تعلق سے سرسید کی یہ عبارت تو آج بھی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ:

> ''میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے واسطے کھود دی جاوے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اس کی زبان میں نہ دیئے جائیں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی وتربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا''۔

غرض کہ سرسید ایک کشادہ ذہن انسان تھے اور علوم وفنون حاصل کرنے کے معاملے میں ہر اس زبان سے استفادہ کرنا چاہتے تھے جس زبان میں ان کے مطلب کا علم دستیاب تھا۔مگر انہوں نے کبھی بھی ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو کو کمتر قرار نہیں دیا بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ اردو زبان ہی ان کا وسیلۂ اظہار تھی۔مولانا شبلی نعمانی نے سرسید کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگر چہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیز خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک

اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ
عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی
ہر قسم کے مضامین اس زور واثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور
صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو
آج تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔'' (مقالاتِ شبلی)

چند محدود ذہن اور تنگ نظر لوگ سرسید احمد پر یہ الزام تراشتے ہیں کہ انہوں نے صرف مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی بدحالی کا رونا رویا ہے اور انہیں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کی اور ان کے مخاطب صرف مسلمان رہے ہیں۔ جب کہ ان کی تقاریر اور مضامین اس حقیقت کی عکاس ہیں کہ ان کی فکر ونظر کا محور کبھی بھی صرف مسلمان نہیں رہے۔ ان کی سانسوں میں اس وقت کا ہندوستان بستا تھا اور وہ اپنے ملک وقوم کی دردناک صورتحال کو دیکھ کر مضطرب تھے اور اس دردمندی نے ان کی تقریروں اور تحریروں میں سوز وگداز بھر دیا تھا۔ ایک مثال دیکھئے:

''پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو اور میری قوم کے بچو
اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تا کہ آخر وقت میں اس بڈھے کی
طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعاء ہے
کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی کی کوشش
کرے''۔ (انتخاب مضامینِ سرسید: ص۔۸۹۔۸۸)

اس اقتباس میں ''ہم وطنو'' اور ''قوم کے بچو'' صرف مسلمانوں کے لئے نہیں کہا گیا ہے۔ مگر کیا کیجئے جب ذہن کسی تعصب وتحفظ کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی سوچ کا دائرہ بھی محدود ہو جاتا ہے اور ویسے ہی محدود ذہنیت کے لوگ سرسید جیسے رہنمائے قوم کے افکار واعمال کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر وقت انصاف پسند ہوتا

ہے وہ کسی ناانصافی کو کب قبول کرتا ہے۔آج ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے بڑے سے بڑے دانشور اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر سرسید اس وقت ملک میں تعلیمی وسماجی تحریک کا آغاز نہیں کرتے تو آج ہندوستان تعلیمی شعبے میں سو سال اور پیچھے ہوتا۔

مگر افسوس صد افسوس کہ سرسید نے مسلمانوں کو تعلیم کے جن نکات سے آگاہ کیا تھا ہم اس پر عمل نہیں کر سکے اور نہ سرسید کے مشن کو آگے بڑھا سکے۔ ورنہ آج ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی، معاشی، اقتصادی اور تعلیمی تصویر اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنی کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ میں پیش کی گئی ہے۔اس لئے تقاضائے وقت یہ ہے کہ ہمارے رہنمائے قوم اور دانشورانِ ملت صرف اپنے فکر وخیال کی دنیا ہی آباد نہ کریں بلکہ صدق دل سے فلاحِ قوم کے لئے عملی قدم بھی اٹھائیں کہ آج سرسید علیہ الرحمہ کی روح پسماندگی قوم پر مضطرب ہے۔

☆☆

مولانا آزاد: ایک مصلح و مفکر

مولانا ابوالکلام آزاد ہماری جنگِ آزادی کے ایک بے خوف مشعل بردار ہی نہ تھے بلکہ ان کی پہلو دار شخصیت کا ہر پہلو تابناک تھا۔ ملک کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین آزادی کے لیے وہ ایک حوصلہ مند سپہ سالار تھے تو مسلم مذہبی حلقوں کے لیے وہ ایک تعمیری سوچ اور فکر رکھنے والے شعلہ بیان مقرر اور بیدار ذہن عالم دین تھے۔ مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے قدیم تاریخ اور تہذیب وتمدن سے روشناس کرانے والے ایک مورخ تھے تو کانگریس پارٹی کے لیے اندھیرے میں چراغ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے آخری لمحے تک ملک وقوم کی بے لوث خدمت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستان کے ایک سچے سپوت ہیں۔

مولانا آزاد ایک حساس ذہن کے مالک تھے ۔انہوں نے ہندوستانی معاشرے کے معاملات ومسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے ہندوستانی عوام کی زندگی کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ اس لیے وہ عوام کے اندر سوئی ہوئی انسانیت کو جگانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جب تک عوام کے اندر کی چنگاری کو شعلہ نہیں بنایا جائے گا اس وقت تک یہ ملک غلامی کے طوق سے نجات حاصل نہیں کر سکتا اور اس کے لیے وہ ہندو مسلم اتحاد کے نہ صرف قائل تھے بلکہ وہ اسے حصول آزادی کے لیے لازمی قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب، ذات پات، فرقہ، قوم اور کسی

فہرست

☆	جہانِ فکر	5-7
☆	سرسید کی عصری معنویت	8-19
☆	سرسید احمد خاں۔ فکر و نظر کے چند پہلو	20-28
☆	مولانا آزاد: ایک مصلح و مفکر	29-40
☆	ترقی پسند تحریک۔ میری نظر میں	41-45
☆	اکیسویں صدی میں پریم چند کی معنویت	46-55
☆	سعادت حسن منٹو: ایک تاثر	56-59
☆	مذہبِ انسانیت کا علمبردار۔ خواجہ احمد عباس	60-71
☆	پروفیسر وہاب اشرفی: کچھ یادیں کچھ باتیں	72-80
☆	پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ناقد و محقق	81-90
☆	پروفیسر لطف الرحمٰن کا نظریۂ شعر و ادب	91-109
☆	اردو کا ایک روشن ضمیر نقاد: لطف الرحمٰن	110-123
☆	کتھا دیس کا البیلا باسی: مشتاق احمد نوری	124-137
☆	نئے امکانات کا ناول نگار: اچاریہ شوکت خلیل	138-144

☆☆

طرح کی گروہ بندی کی حب الوطنی کے سامنے کوئی حیثیت نہ تھی۔1923 کے انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس دہلی میں انہیں سب سے کم عمر صدر کی حیثیت سے خطاب کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

''میں نے آپ کا اس قدر وقت درودیوار کی فکر میں لے لیا حالانکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ ہندوستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہوسکتی ہیں، محض خواب وخیال ہیں۔صرف یہی نہیں کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کرسکتے۔آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کردے کہ سوراج 24 گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہوجائے تو میں سوراج سے دست بردار ہوجاؤں گا، مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''

(خطبات آزاد۔مرتبہ مال رام صفحہ 5-204)

مندرجہ بالا اقتباس مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اور دانشورانہ فکر کا غماز ہے

کہ وہ آزادی ملنے میں تاخیر کو قبول کر سکتے ہیں۔لیکن ہندو مسلم اتحاد کے سوال پر کسی طرح کی مفاہمت کے روادار نہیں کیوں کہ ان کی نگاہ میں فرقہ وارانہ نفاق انسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ مسلمان جنگِ آزادی کے مرکزی دھارے سے ذرا بھی الگ بنتے ہیں تو اس سے ملک اور ملت دونوں کا بڑا نقصان ہوگا۔اور ملک میں نفرت کی ایک دیوار کھڑی ہو جائے گی۔انہوں نے ایک طرف مسلمانوں کو قدم قدم پر ہوشیار کیا کہ وہ کسی طرح کے بہکاوے میں نہ آئیں اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر انگریزی حکومت کو ملک سے نکال باہر کرنے میں ہر محاذ پر ساتھ ساتھ رہیں تو دوسری طرف انہوں نے کانگریس کو بھی خبر دار کیا کہ مسلمانوں کے جائز حقوق کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جائے۔انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے سیاسی مطالبوں کو منوانے کے لیے کسی طرح بھی نفاق کی راہ اختیار نہ کریں۔آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور، 1925 کے اپنے صدارتی خطبے میں انہوں نے کہا تھا کہ :

> ''موجودہ صورتحال کی بدقسمتی اس کام میں کتنی ہی دشواریاں پیدا کردے لیکن وہ تیار نہیں کہ اس نصب العین سے دست بردار ہو جائے۔وہ مسلمانوں کے جماعتی حقوق وفوائد کا تحفظ ضروری سمجھتا ہے لیکن اس طریق عمل سے انکار کرتا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے طرز عمل سے روٹھ کر اجنبی حکومت کی آڑ پکڑ لیں اور ان کی ہستی ہمیشہ ملک کی قسمت کے لیے ایک دھمکی کی طرح استعمال کی جائے۔اگر ہندوؤں سے انہیں منصفانہ طرز عمل کا مطالبہ کرنا ہے تو پوری قوت سے کرنا چاہیے۔لیکن ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ ہماری باہمی آویزش ملکی جنگ کے میدان سے

ہمیشہ الگ رہے۔''

مولانا آزاد ایک مذہبی انسان تھے اور ایک سچا مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ مذہب' قومیت کے تصور میں کہیں دیوار نہیں بنتا بلکہ مذہب انسان کے اندر تعمیری فکر پیدا کرتا ہے۔ان کا خیال تھا کہ ان کا مسلمان ہونا ان کیلئے کسی طرح کی مشکل پیدا نہیں کرتا ان کے ایک خطبے ''مسلمان اور متحدہ قومیت'' سے اقتباس ملاحظہ کیجئے :

''میں مسلمان ہوں اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں اسلام تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔اسلام کی تاریخ' اسلام کے علوم وفنون' اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے' اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں' اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔میں اس کی تکمیل کا ایک

نا گزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے بھی دست بردار
نہیں ہوسکتا۔''

مولانا آزاد مذہب کو کسی طور پر بھی ذہنی ارتقا کے لیے مضر تصور نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ مذہب بچوں کے اندر اخلاقی اقدار پیدا کرتے ہیں اور انسان دوستی اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

1947 میں ملک آزاد ہوا مگر اب وہ ہندوستان نہیں رہا جس ہندوستان کی آزادی کے لیے مولانا آزاد نے اپنا سب کچھ کھویا تھا۔ ملک کی تقسیم نے ان کے ذہن ودل کو متزلزل کر دیا تھا۔لیکن ایسے نازک حالات میں بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔انہوں نے صبر وتحمل کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔انہوں نے مسلمانوں کو جلا وطنی علاحدگی پسندی اور مایوسیوں اور محرومیوں کو ترک کر کے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ جینے اور مرنے کی تلقین کی۔ترک وطن کرنے والے قافلے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اکتوبر 1947 کو جو کچھ کہا تھا،آج بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے کہ جولوگ اپنے ملک کو چھوڑ کر پاکستان گئے وہ آزادی کے ۶۷ ر برسوں کے بعد بھی وہاں اپنے دامن سے مہاجر ہونے کا داغ نہیں مٹا پائے ہیں۔کاش! اس وقت وطن چھوڑ کر جانے والے قافلوں نے مولانا آزاد کی دور اندیشیوں کو سمجھا ہوتا اور ان کے دل کی پکار سنی ہوتی تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔مولانا آزاد کے اس تاریخی خطبے کا لفظ لفظ آج بھی اپنی معنویت رکھتا ہے:

''یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم
نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے
کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔اور آج تم
ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔حالانکہ

دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔ وہ تمہارے ہی اسلاف
تھے جو سمندروں میں اتر گئے' پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا'
بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرادیئے' بادل گرجے تو قہقہوں سے
جواب دیا' صرصر اٹھے تو اس کا رخ پھیر دیا' آندھیاں آئیں تو
ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں۔ یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ
شہنشاہوں کے گریبانو ں سے کھیلنے والے آج خود اپنے
گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے جیسے
اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔''

(خطباتِ آزاد۔ مالک رام صفحہ 340)

مولانا آزاد' آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔اس وقت ملک کے حالات کیسے تھے اس تلخ حقیقت سے ہم آپ خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ ویسے نازک حالات میں مولانا آزاد نے جو نظریۂ تعلیم پیش کیا وہ آج بھی اپنی معنویت رکھتا ہے۔آج جب ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں جی رہے ہیں تو جدید علوم وفنون کو اپنانے کی دور میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔لیکن مولانا آزاد نے اس پرآشوب دور میں ہی ''میکالے'' کے نظام تعلیم کو ترک کر کے جدید نظام تعلیم کو اپنانے کی وکالت کی تھی۔ انہوں نے 18 فروری 1949 کی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ:

''میکالے کا مقصد برطانوی خیر خواہ تیار کرنا تھا لہذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ نظام تعلیم ہماری قومی ضروریات کس حد تک پورا کرتا ہے''۔

آج ہمارے ماہرین تعلیم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم کا ذریعہ اس کی مادری زبان ہو۔مولانا آزاد نے 1949 میں ہی اس بات پر زور دیا تھا

کہ تعلیم کا ذریعہ ملکی زبان ہونا چاہیے۔ واضح ہو کہ اس وقت قومی زبان ہندوستانی قرار پائی تھی۔ لہذا انہوں نے کہا تھا کہ:

"اب وقت آ گیا ہے کہ ملک میں ہر قسم کی تعلیم دیسی زبانوں ہی میں دیے جانے کا تجربہ کیا جائے یہ پسندیدہ امر ہے کہ ہر ہندوستانی دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط سیکھے۔"

مولانا آزاد کا مطالعہ بہت وسیع تھا، خاص طور سے قدیم ادب، عربی، فارسی اور سنسکرت زبان و ادب پر عبور حاصل تھا' وہ ہر وقت جدید سے جدید ترین سائنسی معلومات سے آگاہی حاصل کرنے کے آرزومند رہتے تھے۔ وہ عصری فکری میلانات اور سائنسی رجحانات اور افکار سے نہ صرف باخبر رہتے تھے بلکہ ان کے اثرات کا پوری طرح تجزیہ کرتے تھے۔ وہ مذہب' فلسفے اور تاریخ کے تاریک سے تاریک گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے تھے اور اس میں انہیں بڑی کامیابی بھی ملی تھی۔ ان کو ادب سے والہانہ عشق تھا وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ صحافت کے میدان میں ان کے قلم کی جادوگری نے جس طرح انقلاب کی چنگاری کو شعلہ بنانے کا کام کیا تھا کہ اس میدان میں بھی وہ یکتا رہے۔ ان کے طرز تحریر نے اردو صحافت کو ایک معیار بخشا۔

مولانا آزاد نے عصری تعلیم کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی تاریخی تقریر "عربی نصاب کمیٹی"، لکھنؤ ۲۲رفروری ۱۹۴۷ء میں یہ وکالت کی تھی کہ اب مدارس کے نصاب کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا تا کہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء بھی شعبۂ روزگار میں خود کو کھڑا کر سکیں اور اپنی پوزیشن مستحکم بنا سکیں۔ انہوں نے کہا تھا:

"آپ نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ آپ اپنے مدرسوں کو

زمانہ کی چال کے ساتھ جوڑ سکیں۔زمانہ چلتا رہااور ترقی پر پہنچ گیا اور آپ وہیں رہے جہاں تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم کو زمانے کی مانگوں سے کوئی رشتہ نہیں رہااور زمانے نے آپ کے خلاف آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ کر دیا۔زمانے نے آپ کو بیکار سمجھا ہے آپ کو نکما سمجھا ہے''۔

مولانا آزاد نے تعلیمِ نسواں کی اہمیت قبول کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ جب تک عورتوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم سے آراستہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک وہ اس لائق نہیں ہوسکتی ہیں کہ آنے والی نسلوں کے ذہن کی آبیاری بحسن وخوبی کر سکے۔انھوں نے روایتی تعلیم کی مخالفت تو نہیں کی لیکن اتنا ضرور کہا کہ اب یہ تعلیم بہت دور تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔انہوں نے پردہ کو اسلام کا زیور قرار دیا لیکن یہ بھی کہا کہ جس طرح کے پردے کا چلن ہے اور جس کی بنیاد پر عورتوں کو اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا جارہا ہے وہ قوم کے مستقبل کے لئے مضر ثابت ہوسکتا ہے۔ان کا یہ تاریخی بیان ہے کہ:

''ہم صاف صاف کہہ دیتے ہیں ، اور اسے فیصلہ قطعی سمجھ لو اصول مسلمہ کی طرح مان لو کہ جب تک متعارف پردہ ہندوستان سے نہ اٹھے گا، جب تک عورتوں کو جائز آزادی اور وہ آزادی جس کا اسلام مجوز ہے، نہ دی جائے گی غلامی میں رکھ کر اور پردے کی تقلید کے ساتھ تعلیم دینی نہ صرف فضول بلکہ مضر اور اشد مضر ہے اس کی ایک نہیں بیسوں مثالیں مل جائیں گی کہ اس قسم کی تعلیم برے نتیجے پیدا کرتی ہے یا کم از کم ایسی تعلیم سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا''۔(خطبہ تعلیمِ نسواں۔ہماری قوم میں کیوں کر ہوسکتی ہے؟)

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

مندرجہ بالا اقتباس نہ صرف مولانا آزاد کے نظریۂ تعلیمِ نسواں کی وضاحت ہے بلکہ ان کے نظریۂ حقوقِ نسواں کی بھی مستحکم آواز ہے۔ آج جو لوگ حقوقِ نسواں کی وکالت کرتے ہیں ان کے لئے مولانا آزاد کا یہ نظریہ مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا آزاد کی فکری معنویت ہر زمانے میں برقرار رہے گی ایسے نابغۂ روزگار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد کی علمی صلاحیت اور فکری گہرائی کا اعتراف کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے جو کچھ لکھا تھا اس کا ایک ایک لفظ آبِ زر سے لکھے جانے اور ہمیشہ یار رکھنے کے قابل ہے:

> ''بعض اعتبار سے ان کی طرز فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا اور وہ اس دور کے شعور کا عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنہوں نے اس مقصد کو جس کے لیے وہ عمر بھر کوشاں رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کرسکتا۔ پرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اسے واپس نہیں لا سکتے۔ لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ہم مولانا آزاد کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھ سکتے ہیں۔''

غرض کہ عالمی تاریخ میں جن چند شخصیات کو ''عظیم شخصیت'' کا درجہ حاصل ہے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی نمایاں حیثیت ہے۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے اور بالخصوص امتِ مسلمہ کے لئے مولانا آزاد کی حیثیت گنجہائے گراں مایہ کی ہے۔ آج جب ہم ان کی ۱۲۵ رویں یومِ پیدائش کا جشن منا رہے ہیں تو ہمیں یہ بھی عہد کرنا

چاہئے کہ مولانا آزاد کے افکار ونظریات کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں گے کیوں کہ مولانا آزاد کو یاد کرنا ہمارے لئے صرف ایک رسم نہیں ہے بلکہ یومِ احتساب بھی ہے۔ اس وقت ملک میں جس طرح فرقہ پرست طاقتوں کے ذریعہ انسانیت کی تباہی کے سامان پیدا کئے جارہے ہیں ایسے نازک وقت میں مولانا آزاد کی تعمیری فکر ملک کی سالمیت کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوسکتی ہے۔ واضح ہو کہ ان دنوں سردار پٹیل کی ایک خاص سیاسی جماعت کے ذریعہ قصیدہ خوانی کی جارہی ہے ایسے وقت میں مولانا آزاد کے فکری اثاثے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بعد ملک کی قیادت کانگریس کے ہاتھ آئی تھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو جیسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک کے ہاتھوں میں باگ ڈور تھمائی گئی تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت بھی کانگریس کے اندر چند ایسے لوگ تھے جو پاکستان کے حوالے سے اس ملک میں رہ جانے والے وطن پرست مسلمانوں کو نہ صرف شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ ان کے وجود پر بھی سوالیہ نشان لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے اور اس میں سردار پٹیل بھی شامل تھے۔ سردار پٹیل کی قومی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اس تاریخی حقائق کو بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ سردار پٹیل اقلیت طبقے کے تئیں صاف ذہن نہیں رکھتے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ جس وقت بمبئی پرووِنس میں کانگریس کی حکومت بننے کا وقت آیا تو وہاں کے کانگریس ارکان نے اپنے ہردل عزیز قائد مسٹر نریمن کو پرووِنسیل اسٹیٹ کا سربراہ بنانا چاہا لیکن سردار پٹیل نے ان کی مخالفت محض اس لئے کی کہ وہ اقلیت طبقے یعنی پارسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ گاندھی جی اور نہرو جی مسٹر نریمن کے ہاتھوں میں بمبئی کی قیادت دینا چاہتے تھے لیکن پٹیل نے بی جی کھیر کو لیڈر بنادیا۔ ٹھیک اسی طرح بہار میں ڈاکٹر سید محمود کو کانگریس کے لوگ پرووِنسیل سربراہ بنانا چاہتے تھے کیوں کہ وہ

دانشورِ دوراں، مفکرِ اسلام

حضرت مولانا ولی رحمانی مدظلہٗ العالی

کے نام!

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
(اقبالؔ)

اس وقت آل انڈیا کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے اور بہار کے ہر دل عزیز لیڈر تھے لیکن سردار پٹیل کی ضد نے انہیں یہ موقع نصیب نہیں ہونے دیا اور سری کرشن سنہا کے ہاتھوں میں بہار سونپ دیا گیا یعنی انہیں وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ دراصل مولانا آزاد چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں جو اقلیت طبقے کے لوگ رہ گئے ہیں انہیں مین اسٹریم میں شامل کیا جانا چاہئے اور یہی فکر گاندھی جی اور نہرو جی کی بھی تھی مگر پٹیل کسی طرح بھی اقلیت طبقے کے تئیں اپنے ذہن میں نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے۔ اس کی وضاحت خود ان کی بیٹی منی بین کی ڈائری سے بھی ہوتی ہے۔ جس کا حوالہ سنگھ پریوار سے تعلق رکھنے والے ترون وجئے نے بھی اپنے ایک اخباری مضمون ''سردار پٹیل کے اس روپ سے اپریچیت بھارت'' (مطبوعہ سن مارگ ہندی، پٹنہ۔ مورخہ ۸/نومبر ۲۰۱۳ء) میں کیا ہے:

> ''۲۴/اپریل ۱۹۵۰ء کو سردار پٹیل نے کہا تھا کہ حفیظ الرحمٰن جیسے لوگ بھارت میں رُک گئے ہیں اور وہ بھارت کے اندر ہوم لینڈ بنانے کی بات کریں گے تب ہماری حالت کیا ہوگی۔ اتیہاس ہمیں غدار کہے گا''

یا پھر ۱۶/اگست ۱۹۴۹ء کو سردار پٹیل نے کہا تھا کہ:

> ''بھارت میں رہنے والے چار کروڑ مسلمانوں کو دیس کے پرتی وفادار ہونا ہوگا ورنہ ان کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہوگی''

ترون وجئے نے اپنے اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''گاندھی ہتّیا کانڈ میں متھیہ آروپوں کے کارن راشٹریہ سوم سیوک سنگھ پر پرتی بندھ لگا اور اس کے ہٹنے پر جس میں سردار پٹیل کی بڑی بھومیکا تھی جب سنگھ کے تتکالین سنچالک سری گروجی گول ولکر جیل سے رہا ہوئے تو سردار پٹیل نے پرسنّتا

(خوشی) ظاہر کی۔ ۳؍ اگست ۱۹۴۹ء کی ڈائری میں لکھا گیا گول
ولکر کی رہائی پر پرسن ہوئے باپو (سردار پٹیل)۔ ان کا کانگریس
میں سواگت کرنے ہیتو تیار ہیں۔ ان کا کام ہے کہ گول ولکر اور
سنگھ کا کانگریس میں پرویش آسان بنا دیں''

وجے ترون کے مذکورہ حوالات کی روشنی میں بہ آسانی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آج سنگھ پریوار پٹیل کو مہیما منڈت کیوں کر رہی ہے اور بھاجپا سردار پٹیل کو ہیرو بنانے کی کوشش کیوں کر رہی ہے؟ دراصل جس طرح سنگھ پریوار آزاد ہندوستان میں اقلیت طبقے بالخصوص مسلمانوں کے تئیں ذہنی تعصب رکھتی ہے اس کے علم بردار پٹیل تھے اور یہی بنیادی نکتہ ہے جس پر اس وقت تمام سیکولر ذہن کو غور و فکر کرنا ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کو اُس وقت کے سیاسی تناظر اور ملک کی حالیہ سیاسی و سماجی فضا کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے تو یہ عقدہ خود بخود اجاگر ہو جائے گا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہماری جنگِ آزادی کے ایک بے خوف مشعل بردار ہی نہ تھے بلکہ ان کی پہلو دار شخصیت کا ہر پہلو تابناک تھا۔

☆☆

ترقی پسند تحریک۔ میری نظر میں

تاریخِ تحریکات کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ترقی پسند تحریک ملک کی وہ پہلی تحریک تھی جس کے علمبرداروں نے شعوری طور پر اپنا رشتہ نہ صرف زبان وادب سے جوڑا تھا بلکہ مکمل شعبۂ حیات سے بھی استوار کیا۔ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جسے اس تحریک نے اثر انداز نہ کیا ہو۔ اس سے قبل سر سید احمد خاں کی علی گڑھ اصلاحی تحریک نے ادب اور سماج کو متاثر ضرور کیا تھا لیکن اس تحریک کے مقاصد اور منازل کچھ اور ہی تھے۔ اس لئے اس کا کارواں بھی ایک خاص مقام پر جا کر ٹھہر گیا لیکن ترقی پسند تحریک نے انسانی معاشرہ کے تمام تاریک گوشوں تک روشنی پہنچانے کا جو عہد کیا تھا اس کے لئے اس کا کارواں رواں دواں رہا۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک کا پہلا چراغ ایوانِ ادب میں ہی روشن ہوا تھا لیکن جلد ہی روشنی ایوانِ ادب کے روزن سے باہر پھیلنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے مکمل شعبۂ حیات کی تابناکی کی ضامن بن گئی۔ پریم چند نے جب یہ کہا تھا کہ:

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں

کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''۔

تو یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ ادیب وفنکار کا کام صرف صفحہ قرطاس پر خونِ جگر بکھیرنا ہی نہیں ہے بلکہ ان کی ذمہ داریاں کچھ اور بھی ہیں۔ جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ ادب میں ''تفکر ہو''، ''آزادی کا جذبہ ہو''، ''تعمیر کی روح ہو'' اور ''زندگی کی حقیقتوں کی روشنی'' ہو تو افہام وتفہیم کا مطلع بالکل صاف ہوگیا تھا کہ ادیب وفنکار کو سماجی، سیاسی، تہذیبی وثقافتی یعنی معاشرے کے مسائل کو اپنی فکر کا حصہ بنانا ہوگا اور ترقی پسند ادیبوں، دانشوروں نے پریم چند کی اس آواز پر نہ صرف لبیک کہا بلکہ اسے اصولِ زیست سمجھا اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی کائناتِ احساسات وسکنات کو اپنے افکار ونظریات کا مرکز بنا کر جبر واستحصال، تعصب، فرقہ پرستی اور طبقاتی نابرابری کے خلاف آواز بلند کی۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک سے قبل بھی ہمارے شعراء وادباء نے انسانی کرب واضطراب کو اپنے فن میں جگہ دی تھی لیکن ان کی آواز علامتوں اور استعاروں کی زبان میں تھی۔ مثلاً غالبؔ کا یہ شعر ؎

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

☆

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

واضح ہو کہ 1857ء کی پہلی جنگِ آزادی میں جب ہم ہندوستانیوں کو ناکامیاں ملیں تو انگریزوں نے دلی میں جس طرح قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا تھا

اس ہولناکیوں کی عکاسی غالبؔ نے اپنے شعر میں کی ہے۔غالبؔ کے علاوہ اس عہد کے دوسرے شعراء کے یہاں بھی اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں۔غرض کہ اس عہد کے شعراء نے بھی انفرادی طور پر زمانے کے ظلم وستم کے خلاف اپنی آواز کو شعری قالب میں ڈھالنے کا کام کیا تھا لیکن جب ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی تو انسانی معاشرہ کا کرب اجتماعی غور وفکر کا حصہ بن گیا۔کیوں کہ ترقی پسند تحریک کا ایک منشور تھا جس کی روشنی میں ادیب وفنکار کو اپنا تخلیقی سفر طئے کرنا تھا۔خوابوں کی دنیا سے رشتہ توڑ کر حقیقت کی دنیا میں سانس لینا تھا۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ڈاکٹر نریشؔ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ''ترقی پسندی ایک عمل مسلسل ہے اور مسلسل عمل تب تک اپنے اختتام کو نہیں پہنچتا جب تک اس کا قدم اس کی آخری منزل کو نہ چھولے''

میرا خیال ہے کہ ترقی پسندی ابھی تک اپنی منزل تک نہیں پہنچی ہے۔آج بھی ہمارا معاشرہ ان مسائل سے نبرد آزما ہے جن کے خاتمے کے لئے ہم اور آپ ترقی پسندیت کے قافلے میں شامل ہوئے تھے۔ترقی پسند تحریک سے قبل ہم نے دو عالمی جنگوں کی ہولناکیاں اور نسل انسانی کی تباہیاں دیکھی تھیں۔آج آدھی دنیا امریکہ کے جبر واستحصال کی شکار ہے۔فلسطین سے لے کر افغانستان تک انسانی معاشرے کو جدید سے جدید ترین اسلحوں سے تباہ وبرباد کیا جارہا ہے۔ملک میں مذہب، ذات، رنگ، نسل، بھوک، افلاس، لسانی تنگ نظری، سیاسی مکروفریب، ذہنی تعصب کے ناگ نے اپنا پھن پھیلا رکھا ہے۔سماج میں ایک گھٹن ہے، ایک اضطراب ہے۔جب ترقی پسند

تحریک کی داغ بیل پڑی تھی یعنی آج سے ۷۵ رسال پہلے تو اس وقت ہم غلام تھے اور ایک انگریزی حکومت کے ظلم وستم کے شکار تھے۔ ملکی زمینداروں کے جبر و استحصال سے نجات چاہتے تھے لیکن آج ہمارا ملک آزاد ہے۔ زمینداروں کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ آزادی کے ۶۴ ربرسوں بعد بھی وہ طبقہ جبر واستحصال کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے جس کو اذیت ناک زندگی سے نجات دلانے کے لئے ترقی پسند تحریک وجود میں آئی تھی۔ ذرا نظر اٹھا کر ملک کے نقشے کو دیکھئے اور سنجیدگی سے غور کیجئے گذشتہ دو دہائیوں میں فرقہ پرستی نے انسانی اقدار کو کس طرح پامال کیا ہے۔ انسانیت کی روح مجروح ہو کر رہ گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ 36-1935 کے جو حالات تھے اس سے کہیں زیادہ گھٹن اور بے چینی آج کے سماج میں ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جس طبقے کو اندھیروں سے نجات دلانے کے لئے ترقی پسندیت نے بغاوت کی چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ کا روپ دینے کا کام کیا تھا وہ چنگاری بجھی تو نہیں ہے لیکن راکھ کے ڈھیر میں دب ضرور گئی ہے اور حالات کا تقاضہ ہے کہ اس چنگاری کو پھر شعلہ بنایا جائے۔

یہ سچ ہے کہ آج بھی بہت ایسے ادیب وفنکار ہیں جن کی فکر ترقی پسندیت کے چراغ سے روشن ہے اور وہ عہدِ حاضر کے سلگتے مسائل کو اپنی فکر کا حصہ بھی بنا رہے ہیں وہ انفرادی طور پر غیر انسانی رویے کے خلاف آواز بھی بلند کر رہے ہیں لیکن ان کی آوازیں صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی ہیں اور وہ خود کو تنہا پا کر احساسِ شکست کے شکار ہو رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ترقی پسندیت نے جس قوت سے فرد کو قافلہ میں تبدیل کیا تھا اور ایک مشترکہ لائحہ عمل مرتب کیا تھا اگر آج بھی ہم اسی حوصلے اور قوت سے اجتماعی نشانہ طئے کر لیتے ہیں تو نہ صرف منزل کا راستہ ہموار ہوگا بلکہ ہم منزل

تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ سردار جعفری نے ''گفتگو'' شمارہ جون ۱۹۷۵ء کے ''پیشِ گفتار'' میں لکھا تھا کہ اب اکثر پرچم پر اس قسم کے نعرے لکھے ہوتے ہیں ''میں بکھر گیا ہوں، میں ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں، میں کھو گیا ہوں، کوئی مجھے تلاش کرے، میں اندھیرے کی گرفت میں ہوں'' کاش! ۳۶ر سال قبل ہم نے سردار جعفری کی اس فکر کو اپنی فکر کا حصہ بنا لیا ہوتا تو شاید آج ترقی پسند تحریک کی ۷۵ر ویں سالگرہ کے موقع پر اپنی فتوحات پر کچھ زیادہ ہی شاداں ہوتے اور جشن میں ڈوبے ہوتے۔ لیکن مایوس نہیں ہونا ہے، اب بھی وقت ہے، ہم ایک بار پھر اجتماعی طور پر انسانی معاشرے کے کرب کو اپنی سوچ کا حصہ بنالیں اور اپنے سرمایۂ فکر کو حقیقت، مقصدیت اور افادیت کا ترجمان بنالیں تو وہ دن دور نہیں کہ ہم ان طاقتوں کو چیلنج کر سکیں گے اور شکست بھی دیں گے جن کے غیر انسانی حرکات و سکنات سے ہمارا انسانی معاشرہ دم توڑ رہا ہے۔ میں اپنی بات فیضؔ کی اس فکرِ فردا کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہوں ؂

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

☆☆

اکیسویں صدی میں پریم چند کی معنویت

اکیسویں صدی میں اردو زبان وادب کے سامنے یہ ایک بڑا چیلنج ہے کہ آخر اردو زبان کس طرح بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرے۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبے میں انقلاب برپا ہو گیا ہے اور جس کی شدت دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اب چوں کہ دنیا ایک بازار بن گئی ہے اس لئے ہر ایک میدان میں مقابلہ بڑھ گیا ہے اور جس کی وجہ سے روایتی زندگی کا توازن بھی یکسر بدل گیا ہے۔ ادب میں بھی کچھ اس طرح کی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے جب زندگی جینے کے طریقے بدل رہے ہیں تو زندگی کا آئینہ یعنی ادب میں بھی ہماری تصویر بدلے گی اور ضرور بدلے گی کہ یہ ایک فطری عمل ہے۔

اکیسویں صدی یعنی عالمیت کے دور میں وہی ادب اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے جو وسیع سے وسیع تر ہوتے ہوئے بازار کی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ جو معقولیت پسندی پر مبنی فروغِ انسانی وسائل کے توسط سے مہارت پیدا کرتا ہو۔ جسے صرف اس ادب کے پڑھنے والوں کا ہی نہیں بلکہ مارکیٹ کا بھی سہارا ہو۔ چوں کہ اردو ادب صرف برصغیر تک محدود نہیں ہے اور عالمی سطح پر اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ادب کو عالمی بازار میں پوری توانائی کے ساتھ پیش کریں۔ کیوں کہ اردو زبان وادب میں یہ صلاحیت ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ اب جہاں تک سوال پریم چند کا ہے تو

پریم چند کا ادب ایک ایسا ادب ہے جس میں وہ علمی اور فکری سرمایہ موجود ہے جس کی مدد سے ہم اکیسویں صدی میں بھی ذہنی سکون حاصل کر سکتے ہیں اور ان طاقتوں کو اپنی گرفت میں لا سکتے ہیں جن کے ذریعہ اپنی پسماندگی اور بے کسی کا ازالہ کر سکیں۔

پریم چند صرف ایک ادیب ہی نہیں تھے بلکہ ایک سماجی مصلح، مفکر و دانشور اور مذہب انسانیت کے ایک بڑے علمبردار بھی تھے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ایک عظیم شخصیت کی سب سے بڑی عظمت یہ ہوتی ہے کہ اس کے متعلق ہر پڑھا لکھا آدمی کچھ نہ کچھ جانتا ہے اور اسے اپنے فہم وادراک سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مکمل پریم چند کو سمجھ پانا اور ان کی شخصیت کو چند صفحات میں لکھنا کوئی آسان اور ممکن کام نہیں۔ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ایک عظیم انسان کی زندگی کے پہلو بھی بدلتے ہیں اور آنے والی نسلیں اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے طور پر انہیں سمجھنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ چوں کہ پریم چند کی شخصیت بھی ایک عہد ساز شخصیت ہے اس لئے ان کو بھی ہر ذی علم انسان اپنے طور پر سمجھتا ہے اور یہی ان کی عظمت وانفرادیت ہے۔

اکیسویں صدی کی یہ پہلی دہائی ہے۔ آج یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ اس بدلتے ہوئے حالات میں پریم چند کی معنویت کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پریم چند کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظریات اب پرانے ہو چکے ہیں اور آج ہمارے سامنے جو مسائل کھڑے ہیں ان کے سامنے پریم چند کی تھیوریاں کام نہیں کر سکتی ہیں لیکن سچائی بالکل اس کے برعکس ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج بھی پریم چند اور ان کے خیالات ہمارے لئے اتنے ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنے اس عہد میں تھے۔ پریم چند کو کسی خاص وقت اور دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ پریم چند صرف اپنے وقت کے لئے نہیں تھے۔ وہ اپنے عہد میں جتنے اہم تھے اتنے ہی آج بھی ہیں اور آج سے

کہیں زیادہ اہم وہ کل ثابت ہوں گے۔

اس حقیقت کا سبھی لوگ اعتراف کرتے ہیں کہ پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اردو ادب میں مختصر افسانے کی مستحکم روایت قائم کی اور اردو ناول کو فنی لحاظ سے نہ صرف وقار عطا کیا بلکہ اعتبار کا درجہ بھی بخشا۔ ناول نگاری نے ان کو دنیائے ادب میں ایک اعلیٰ اور منفرد مقام عطا کیا تو ان کی افسانہ نگاری بھی کم اہمیت کی حامل نہیں کیوں پریم چند کے افسانے فکری وفنی ہر دو اعتبار سے ان کی انفرادیت وعظمت کی ضامن ہے۔ یوں تو ہر عہد میں سماج کے کمزور لوگوں سے ادیب کی وابستگی اور ہمدردی رہی ہے لیکن پریم چند نے جس ایمانداری سے سماج میں حاشئے پر کھڑے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اس کی مثال نہ تو ان کے پیش رؤں کے یہاں دکھائی پڑتی ہے اور نہ ہی ہم عصروں کے یہاں جھلکتی ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند اپنے پیش رؤں اور ہم عصروں سے منفرد نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کے لئے پریم چند نے شعوری کوشش کی بلکہ اس عہد کی *Sensibility* کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ لیکن اس تقاضے کو پورا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی بلکہ اس لحاتی چیلنج کو وہی ادیب قبول کرسکتا تھا جو پریم چند کی طرح وقت کی دکھتی رگ کو پکڑنے کا ہنر جانتا ہو۔ پریم چند ایک بالیدہ شعور کے مالک تھے۔ ان کا ذہن حساس تھا انہوں نے ہندوستان کے عوام کے مسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ خود گاؤں، دیہات کی زندگی جی کر آئے تھے اور شہروں کی چمک دمک سے بھی واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی کہانیوں کا موضوع بادشاہوں، شہزادوں جنوں اور پریوں کی پرفریب فرضی زندگی کو نہیں بنایا بلکہ سماج کے اس دلت، پسماندہ طبقے کی زندگی کو بنایا جس کی طرف اب تک بھول کر بھی کسی نے جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پریم چند نے شعوری طور پر اس طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی

جہانِ فکر

''احتسابِ فکر و نظر'' میرے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں بیشتر ایسے مضامین ہیں جو قبل از جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ بعض مضامین تو پیش پا افتادہ بھی ہیں کہ ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میرا یہ دعویٰ تو نہیں لیکن یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان مضامین میں بھی خاکسار نے اپنی تنقیدی بصیرت و بصارت کی بدولت حتی المقدور یہ کوشش کی ہے کہ قارئین کو فکرِ نو کا احساس ہو سکے۔ اردو تنقید کے متعلق میری جتنی سمجھ ہے اس پر میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا ہوں۔ واضح ہو کہ بہت پہلے میں نے پروفیسر لطف الرحمٰن کے حوالے سے جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی اپنا نظریۂ نقد پیش کیا تھا۔ یہاں ایک بار پھر اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری اردو تنقید سو سال سے زائد عرصے کا سفر طئے کر چکی ہے کہ حالؔی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' اور امداد امام اثر کے ''کاشف الحقائق'' سے اردو میں باضابطہ تنقید کی بنا پڑی۔ قبل از اساتذہ کا اپنے تلامذہ کے کلام پر اصلاح یا تذکرہ نگاروں کی رائے تک ہی اردو تنقید کی دنیا محدود تھی۔ مولانا محمد حسین آزاؔد نے ''آبِ حیات'' میں جو تنقیدی آرا پیش کی اسے آپ چراغِ نو تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار

کوشش کی، ساتھ ہی ساتھ ان کی زندگی کو عام زندگی کا حصہ بنانے کے لئے جد وجہد جاری رکھی۔ کیوں کہ پریم چند جیسا حقیقت پسند فنکار اپنے عہد کے خوابیدہ اور دم توڑتی انسانیت کو بیدار کئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ پھر پریم چند تو شروع سے ہی ایک اصلاح پسند تھے اور آخر تک ایک مصلح کی طرح سماج کو بدلنے اور اپنی صحت مند فکر سے آشنا کرانے کی کوشش کرتے رہے جس میں انہیں بڑی کامیابی بھی ملی۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے افسانوی ادب کے مطالعے سے بیسویں صدی کے ابتدائی ہندوستان کے سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین نے ٹھیک ہی لکھا ہے ''پریم چند پہلے ادیب ہیں جنہوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی''۔

پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے منشی دیانرائن نگم کے نام اپنے ایک خط میں اپنی ادبی زندگی کا سالِ آغاز ۱۹۰۱ء بتایا ہے۔ پریم چند شروع میں ''زمانہ'' کانپور میں لکھتے رہے۔ ان کی پہلی کہانی ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ہے جو ''زمانہ'' کانپور میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد وہ لگاتار کہانی لکھتے رہے۔ ۱۹۰۹ء میں ان کی پانچ کہانیوں کا مجموعہ ''سوزِ وطن'' شائع ہوا۔ اس وقت تک پریم چند نواب رائے کے نام سے ہی لکھا کرتے تھے۔ ''سوزِ وطن'' پر حکومت کی پابندی کے بعد انہوں نے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ امرت رائے کے مطابق پریم چند کے نام سے شائع ہونے والی پہلی کہانی ''بڑے گھر کی بیٹی'' ہے جو ''زمانہ'' کانپور میں ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

پریم چند کے یہاں آغاز سے ہی سماجی زندگی کی عکاسی اور اس عہد کے سیاسی وعصری حالات ومسائل کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالباً پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے شہری زندگی کے علاوہ دیہاتی زندگی کو بھی اپنی تخلیق میں جگہ

دی ہے اور دیہات میں رہنے والے کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے درد کو اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے۔ مختصر یہ کہ پریم چند نے اردو افسانوی ادب کو سماجی سروکار سے جوڑنے کا کام کیا۔ پریم چند سے قبل اردو ادب بالخصوص افسانوی ادب بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں، جنوں اور پریوں کے ارد گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ جب کہ پریم چند نے ایمانداری کے ساتھ سماج کے حاشئے پر کھڑے محروم طبقے کو اپنا موضوع بنایا۔ یہاں میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ لوگوں نے پریم چند کو صرف دلت اور پسماندہ طبقے کی کردار کا خالق کہہ کر ان کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں اس غلط فہمی کو پروان چڑھانے میں ہمارے ترقی پسند ناقدوں کا کچھ زیادہ ہی رول رہا ہے۔ اگرچہ ترقی پسند ناقدوں نے ایسا مصلحتاً کہا تھا لیکن یہ غلط فہمی کچھ قدر جڑ پکڑ گئی کہ پریم چند کا جہاں کہیں بھی ذکر چھڑا تو بس یہی روایتی جملہ دہرایا جانے لگا کہ پریم چند کسانوں، مزدوروں اور دلت طبقے کے فنکار ہیں جب کہ پریم چند جیسے حساس فنکار کبھی کسی خاص طبقے تک محدود نہیں رہ سکتے تھے۔ بقول پروفیسر لطف الرحمٰن:

> ''پریم چند کا مطالعہ کرتے ہوئے عام طور پر ان کے یہاں ترقی پسند عناصر، نچلے طبقوں کی آئینہ داری وغیرہ جیسے موضوعات مقرر کر لئے جاتے ہیں جن سے ان کی زندگی یا فن کا کوئی ایک پہلو نسبتاً منور ہو کر سامنے آجاتا ہے لیکن ان کی شخصیت وفن کی مجموعی خوبیاں پس پردہ رہ جاتی ہیں''۔

(پریم چند کے سیاسی نظریات۔ نقد نگاہ۔ مطبوعہ ۲۰۰۶ء ص: ۱۶۰)

لیکن پریم چند کو جن لوگوں نے سنجیدگی سے پڑھا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ پریم چند کے یہاں اگر کسان، مزدور، تاجر، مہاجن، ملاّ، پنڈت

اور طوائف کا کردار ہے تو ساتھ ساتھ ان کے یہاں راجے، مہاراجے، ڈاکٹر، وکیل اور سیاسی لیڈر کے کردار بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کے عوام کے مسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا، چوں کہ اس وقت کے سماج میں مادھو، گھیسو، ہوری جیسے کردار کے مسائل کچھ زیادہ ہی اہم تھے اس لئے پریم چند جیسے حساس اور ذہین فنکار ان کرداروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ ایک حساس اور بڑے فنکار کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے مسائل سے دامن نہیں بچا سکتے اور وہ اپنے عہد کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں۔ پریم چند کی عظمت کا راز بھی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے چیلنج کو قبول کیا اور وقت کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے خوابیدہ سماج کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

پریم چند ایک حقیقت پسند فکشن نگار تھے۔ انہوں نے شعوری طور پر سماج کے پسماندہ طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے افسانوی ادب کے مطالعہ سے بیسویں صدی کی ابتدائی ہندوستانی سماج کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اردو کے دانشور نقاد اور ماہر پریم چند پروفیسر قمر رئیس نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پریم چند نے اردو زبان و ادب اور اس کے سرمایہ فکر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ انہوں نے زندگی اور کائنات کو فکر و نظر کے مروجہ زاویوں سے ہٹ کر ایک نئی سطح سے دیکھا۔ ایک ایسی بلند سطح سے، جہاں سے زندگی اور انسانیت کا سمندر کروٹیں لیتا اور ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ وہ پہلے ایب ہیں جن کی نظر حیات انسانی کے اس انبوہ میں ان مجبور اور مقہور انسانوں تک پہنچی جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے

گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انہیں زبان دی۔ ازلی پسپائی اور پسماندگی کے شکار یہ ہندوستان کے دبے کچلے کڑوروں انسان تھے جو ملک کی غالب اکثریت اور اس کی دولت، تہذیب اور شان وشوکت کے خالق تھے"۔
(پریم چند کی روایت اور معاصر اردو فکشن۔ ایوانِ اردو، دہلی۔ نومبر ۲۰۰۶ء ص:۵)

پریم چند کے ۲۸۸ افسانے اور ایک درجن ناولوں کے علاوہ سینکڑوں مضامین اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ پریم چند کو پڑھنا ہمارے لئے اس لئے بھی ضروری ہے کہ پریم چند کو پڑھے بغیر ہم اردو افسانوی ادب کے سمت و رفتار سے واقف نہیں ہو سکتے۔ پریم چند کی تقریباً پچیس سالہ ادبی زندگی کا بڑا حصہ صرف اردو کے نام ہے اور اس لئے پریم چند مکمل طور پر اردو کے فنکار اور ادیب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ ہم اردو والوں کی خوش بختی ہے کہ پریم چند جیسے عظیم فنکار بنیادی طور پر اردو کے فنکار ہیں۔

اب چوں کہ گفتگو طویل ہو رہی ہے اس لئے یہاں میں پریم چند کے آخری دور کے حوالے سے اپنی بات کو سمیٹنا چاہتا ہوں۔ اس دور میں پریم چند نے مزدوروں، بیکسوں اور سماج کے دبے کچلے طبقے کے لوگوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ واضح ہو کہ پریم چند کا آخری دور ۱۹۳۲ء سے ان کی موت تک کا زمانہ ہے اور اس دورِ آخر کو پریم چند کی افسانہ نگاری کا عہدِ زریں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں پریم چند کے چار افسانوی مجموعے "آخری تحفہ"، "زادِ راہ"، "دودھ کی قیمت" اور "واردات" شائع ہوئے ہیں۔ بلکہ "واردات" تو ان کی موت کے بعد ہی شائع ہو سکا تھا۔ پریم چند کے اس دور کے افسانوں میں پہلے دور کی بہ نسبت موضوع اور مواد کے اعتبار سے

زیادہ وسعت ہے۔ سماج کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔ اس دور کے فرسودہ رسم ورواج پر طنز بھی کیا گیا ہے اور پیچیدہ مسائل کے حل کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ اس دور میں پریم چند کی مثالیت پسندی کا رنگ بھی مدھم ہو گیا ہے اور گھسی پٹی رومانیت اور خیالی باتوں سے بھی دامن بچایا گیا ہے۔ افسانوں کے کردار حالات کے شکنجے میں پھنسے نہیں دکھائی دیتے بلکہ حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا یہ دور بڑا ہی پیچیدہ تھا۔ اس دور میں ایک طرف عالمی سطح پر معاشی بحران تھا تو دوسری طرف برصغیر میں سیاسی تحریکوں کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ہر ایک چہرے پر مایوسی اور اضطراب کے اثر دات نمایاں تھے۔ دیہاتوں میں مزدور بے بس تھے، نچلے طبقے کے لوگوں کو کچلا جا رہا تھا۔ گاندھی جی ملک کی آزادی کے لئے عدم تعاون کی تحریک چلا رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ سائمن کمیشن کی آمد، گول میز کانفرنس کا انعقاد، ترک مواصلات اور سودیشی تحریکوں نے ایک عجیب سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ پریم چند نے ان سب واقعات کو اس دور کے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اس حقیقت نگاری کی وجہ سے پریم چند، گاندھی جی سے بہت قریب بھی ہو گئے تھے اور ادب میں گاندھی واد کی نمائندگی بھی کرنے لگے تھے جس کی مثال ان کا ناول ''میدانِ عمل'' ہے۔ فنی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس دور میں پریم چند کی تخلیق میں کچھ زیادہ ہی پختگی آ گئی تھی۔ جذباتی اُبال کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، ماحول اور اسلوب بیان فنی تقاضوں کے مطابق تھا۔

اس آخری دور کی کہانیاں ''آخری تحفہ''، ''کفن''، ''دودھ کی قیمت'' اور ''معصوم بچہ'' آج بھی اردو کی شاہکار ہیں۔ ''آخری تحفہ'' افسانوی مجموعہ ''آخری تحفہ'' کا پہلا افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں اس وقت چل رہی سودیشی تحریک اور چرخہ تحریک کی عکاسی کی گئی ہے اور ساتھ ہی ملک سے محبت اور آزادی کے جذبے کو ابھارا گیا

ہے۔ افسانہ ''قاتل'' جو سیاسی موضوع پر لکھا گیا ہے ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں گاندھی جی کے Non-violence کی تبلیغ کی گئی ہے۔ ''دو بیل'' لکھ کر پریم چند نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ صرف انسانی کرداروں سے ہی افسانے نہیں لکھے جا سکتے بلکہ جانوروں کے کرداروں سے بھی ایک کامیاب افسانہ وجود میں آسکتا ہے۔ اس کہانی کے ذریعہ محبت وایثار اور دوسرے انسانی جذبوں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''زیور کا ڈبہ'' سرمایہ دارانہ نظام کے موضوع پر ایک کامیاب افسانہ ہے جس میں انسانی تعلقات کے بحران اور غلط معاشرتی اقدار کے فروغ کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ افسانہ ''آشیاں برباد'' سیاسی پس منظر کا افسانہ ہے جس میں ۱۹۱۹ء میں ہونے والا جلیاں والا باغ کے حادثے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ''زادِ راہ'' پریم چند کی حقیقت نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے جس میں پریم چند نے سماج کی جھوٹی آن بان اور غلط رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ''دودھ کی قیمت'' پریم چند کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں طنزیہ اسلوب کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری بھی ہے۔ ''اکسیر'' بیوہ عورت کے مسائل پر لکھی ہوئی کامیاب کہانی ہے جب کہ ''ریاست کا حیوان'' اس دور کا ایک کامیاب افسانہ ہے۔ ''عید گاہ'' میں نازک انسانی جذبوں کو دکھایا گیا ہے۔ ''گلی ڈنڈا'' بچپن کی حسین یادوں کا البم ہے تو افسانہ ''نئی بیوی'' اور ''وفا کا دیوتا'' نفسیاتی علاج کا افسانہ ہے اور ''کفن'' میں تو پریم چند کا فن اپنے بامِ عروج تک جا پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبیر رضوی نے اپنے رسالے ''ذہنِ جدید'' میں اردو کے دس قابلِ ذکر افسانوں کے نام اردو کے ۲۷ رممتاز ادیبوں سے پوچھے تھے۔ ان تمام ادیبوں نے اردو کے دس افسانوں میں پریم چند کے ''کفن'' کو سرِ فہرست رکھا تھا۔ اس فیصلہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بدلتے زمانے اور حالات کے باوجود بقول زبیر رضوی افسانہ ''کفن'' آج بھی ہمارے عصریت اور ادبی

حسیت کے دائرے میں جاگتا اور جگمگاتا ہے''۔

ایک عظیم فنکار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقی معنویت اور بڑھتی جاتی ہے۔ پریم چند اردو کے واحد فکشن نگار ہیں جن کے فکر کا سورج ہر زمانے میں عدم مساوات، ظلم وجبر، فرقہ پرستی، تعصب پرستی، تنگ ذہنی وتنگ نظری اور ہر طرح کی ناانصافیوں کی تاریکیوں کو مٹانے کی قوت رکھتا ہے۔اس لئے اکیسویں صدی میں بھی پریم چند کی تخلیقی شناخت اتنی ہی مستحکم ہے جتنی کہ بیسویں صدی میں تھی کیوں کہ جس طرح ''پوس کی رات'' کا ہلکو کڑے جاڑے کی رات میں زمینداروں کے قرض اور جبریہ مزدوری کے خوف سے بغیر گرم کپڑے کے اذیت ناک زندگی گذارنے پر مجبور ہے آج گجرات میں نریندر مودی جیسے سیاسی ساہوکار کے ظلم و جبر نے لاکھوں بے قصور اور معصوم انسانوں کو بے گھر کردیا ہے اور ان کو کیمپ کی زندگی جینے پر مجبور کردیا ہے۔ عالمی سطح پر نگاہ ڈالیں تو آج امریکہ نے افغانستان اور عراق میں لاکھوں ہوری، مادھو، گھیسو اور دھنیا پیدا کردئے ہیں۔ پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آج یعنی اکیسویں صدی میں پریم چند Relevant نہیں ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پریم چند ادبیات کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کریں اور نئی نسل کو پریم چند کی عصری معنویت سے آگاہ کریں تاکہ وہ اردو کے اس عظیم فنکار کے افکار ونظریات سے استفادہ کرسکیں۔

☆☆

سعادت حسن منٹو۔ایک تاثر

اردو کے جن فنکاروں کی بدولت اردو کہانی کو عالمی ادب میں ایک مستحکم شناخت ملی ان میں سعادت حسن منٹو (۱۱رمئی ۱۹۱۲۔۱۸رجنوری ۱۹۵۵ء) کا نام سرِفہرست ہے۔منٹواردوادب کے افق پراس وقت نمودار ہوئے جب ترقی پسندیت نے اپنے لئے زمین تیار کرلی تھی اورترقی پسندادیبوں نے اپنی ایک جماعت بنالی تھی۔ پریم چند کی روایت آگے بڑھانے کی نئ کوشش شروع ہوگئی تھی۔ واضح ہو کہ اردو میں پریم چنداولین افسانہ نگار تھے جنہوں نے حقیقت نگاری کواپنی فکر کامحور بنایا تھا۔لکھنؤ میں جب ۱۹۳۶ء میں پریم چند کی صدارت میں ترقی پسندتحریک کی بنیاد پڑی تو اردو کہانی کا نہ صرف کرداراور موضوع بدلا بلکہ اردوافسانے کی دنیاہی بدل گئی۔اگرچہ منٹو باضابطہ طورپرترقی پسندتحریک کے ممبرکبھی نہیں بنے لیکن ان کی غوروفکر کامحورومرکز بھی ترقی پسندیت ہی تھی۔لیکن منٹواپنے ہم عصروں سے اس معنی میں ممتاز ومنفرد تھے کہ انہوں نے کبھی بھی خودکوکسی خاص دائرے میں محدودنہیں کیا تھا۔منٹو نے ہمیشہ سماج کے اس روپ کو ہو بہو پیش کیا جسے سماج کا ایک خاص طبقہ کسی طورپربھی عیاں ہونے نہیں دینا چاہتا تھااس لئے منٹو پرطرح طرح کے الزام بھی لگائے گئے۔کبھی فحش نگار کہا گیا تو کبھی جنس پرست،۔لیکن سچائی یہ ہے کہ منٹوایک بڑافنکارتھا اور وہ کسی نا انصافی کوقبول نہیں کرسکتا تھااس کے اندرکا فنکاردم توڑتی انسانیت ،سماج میں پاؤں پھیلاتی برائیاں ،ٹوٹتے بکھرتے انسانی رشتے ،مذہب اورذات کے خانوں میں بٹتا سماج ،اندراندرکھوکھلا ہوتا ہواانسان اورسیاسی مفادپرستوں کی چالوں سے وطن کی تقسیم

کو بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔نتیجتاً منٹو کی ہر ایک کہانی کا کردار ہمارے سماج کے کسی نہ کسی گھناؤنے روپ کو پیش کر رہا تھا۔یہی وجہ ہے کہ منٹو کو ان کے ہم عصروں نے بھی حسد کی نگاہ سے دیکھا اور انہیں ایک فحش نگار اور باغی افسانہ نگار کہہ کر ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔یوں تو ملک کی تقسیم اور پھر فسادات کے موضوع پر ملک کی مختلف زبانوں کے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے اور انسانیت کی تباہی کے بھیانک روپ کو پیش کیا۔مثلاً ہندی میں مہیپ سنگھ کی کہانی ''پانی اور پُل''، رامانند ساگر کی کہانی ''اور انسان زندہ ہے'' اور اسی طرح دوسری زبانوں میں بھی کئی اہم کہانیاں لکھی گئیں۔اردو میں بھی بیدی نے ''لاجونتی'' جیسی لازوال کہانی لکھی۔واضح ہو کہ ان کہانیوں میں فساد کے بعد سماج میں جو بکھراؤ پیدا ہوا اور بالخصوص عورتوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے گئے اس کی عکاسی کی گئی۔لیکن فساد کے موضوع پر منٹو نے جو افسانے لکھے وہ نہ صرف اردو ادب کے لئے سرمایۂ عظیم کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ہندوستانی ادب میں بھی اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے ان کے افسانے منفرد تسلیم کئے جاتے ہیں۔منٹو کا افسانہ ''کھول دو''، ''کالی شلوار''، ٹھنڈا گوشت''، ''بو''، کو باٹیک سنگھ'' وغیرہ میں فساد کے بعد انسانیت کی تباہی بالخصوص عورتوں کی تار تار ہوتی ہوئی زندگی کی جس طرح عکاسی کی گئی ہے اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔یہ افسانے صرف افسانے نہیں ہیں بلکہ دم توڑتی ہوئی انسانیت کے آئینہ دار ہیں۔جس کی عکاسی صرف اور صرف منٹو ہی کر سکتے تھے۔

منٹو مذہبِ انسانیت کے ایک بڑے نمائندہ تھے۔ان کی نگاہ میں انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں تھا اس لئے انہیں جب کوئی یہ کہتا تھا کہ فسادات میں کتنے ہندو مرے ہیں یا کتنے مسلمان مرے ہیں تو وہ آگ بگولا ہو اٹھتے تھے۔وہ کہتے تھے مرنے والا مسلمان ہے نہ ہندو وہ تو صرف انسان ہے اپنی ایک کہانی میں اپنی فکر کو

یوں اجاگر کرتے ہیں:

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں''

اپنی ایک مشہورِ زمانہ کہانی ''رام کھلاون'' میں بھی کچھ اسی طرح کی بات کہتے ہیں:

''ایک اتوار میں گھر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کھیلوں کے صفحے پر کرکٹ کے میچوں کا اسکور درج تھا اور پہلے صفحہ پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعداد و شمار۔ میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا''۔

منٹو کے افسانوں میں طوائف کی زندگی اور اس کے متعلق ہمارے سماج کی سوچ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ منٹو کو بدنام کرنے والوں کی نگاہوں میں منٹو کے افسانوں میں جنس کی پیشکش نے انہیں فحش نگار بنا دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو نے طوائف کی زندگی کی سچی تصویر کشی کر کے سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔ کوئی عورت اپنی پیدائش سے طوائف نہیں ہوتی بلکہ حالات اور ہمارے سماج کے کچھ سفید پوش لوگوں کی وجہ سے ایک پاکیزہ عورت بھی طوائف خانے کی غلیظ گلیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ منٹو نے اپنے افسانے ''دس روپۓ''، ''ممّی''، ''بابو گوپی ناتھ'' اور ''لائسنس'' میں ان سچائیوں کو پیش کیا ہے۔ ''سڑک کے کنارے''، ''خدا کی قسم''، ''ہتک'' اور ''پھوبا بائی'' میں بھی طوائف کے کردار کے سہارے عورت کے مختلف روپ اور اس کی جبلت کے ساتھ ساتھ سماج کے گھناؤنی کرتوتوں کو منٹو نے اجاگر کیا ہے۔

مجموعی طور پر منٹو کے افسانے، ناول اور مضامین منٹو کو ایک انسان دوست فنکار کی حیثیت عطا کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ سماج کی اس تصویر پر سے پردہ ہٹانے کی آخری سانس تک

نہیں کرسکتے کہ مولانا آزاد کی تنقید ان کی ذاتی پسند و ناپسند تک محدود تھی اس لئے ان کی نگاہ میں استاد ذوق کی شاعری کے سامنے مرزا غالب کی شاعری ہیچ نظر آتی ہے۔ یا پھر دوسرے شعراء پر بھی ان کا تبصرہ محض برائے تبصرہ ہی ہے۔ مگر پھر بھی بقول پروفیسر کلیم الدین احمد ''آزاد دنیائے تنقید میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں بناتے لیکن ''آبِ حیات'' پرانے تذکروں پر فوقیت رکھتی ہے''۔ لیکن بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد مغربی نظریۂ نقد کے اثرات نے اردو تنقید کی فضا کو ساز گار کیا اور اب اردو تنقید کے معیار و وقار کا خیال رکھا جانے لگا۔ نتیجتاً تنقید کی اہمیت وافادیت تسلیم کی جانے لگی لیکن مغربی فکر نے مشرقی نظریۂ نقد کا بیڑا غرق کردیا۔ حالؔی، اثؔر اور شبلؔی کے افکار و نظریات سے استفادہ کرنا معیوب اور کم علمی تصور کیا جانے لگا جب کہ مغربی نقادوں کے افکار و نظریات کی نقالی کو دانشوری سمجھا جانے لگا۔ اب تخلیق کار آئینۂ تنقید میں اپنی مکمل تصویر دیکھنے کا اضطراب لئے ناقدینِ ادب کے حضور میں سلام پیش کرنے لگا۔ تخلیق کار کی یہ جی حضوری ایک طرف تنقیدی سرمایے میں اضافے کی باعث بنی تو دوسری طرف تنقید کے نام پر قصیدہ و تنقیص کا انبار جمع ہونے لگا۔ گروہ بندی پروان چڑھنے لگی اور تنقید میں یہ روش عام ہونے لگی کہ ''تم مجھے برا نہ کہو اور میں تمہیں اچھا لکھوں''۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید کی ایک صدی مکمل ہونے کے بعد بھی افقِ تنقید پر بس انگلیوں پر گنے جانے والے درخشاں ستارے نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک جس نے ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے کا کارنامہ انجام دیا لیکن ترقی پسندی نے تو تنقید کے بنیادی تقاضے کو ہی پسِ پشت ڈال دیا کہ بونے کو بھی قد آوری بخشنے کے لئے غور و فکر کے تمام دروازے بند کر لئے گئے اور یہ تمیز ختم ہوگئی کہ اصطبل میں گھوڑا کون ہے اور گدھا

جدوجہد کرتے رہے جسے ہمارے سماج کا سفید پوش طبقہ کبھی بھی عیاں ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ منٹو جب سماج کی صحیح تصویر پیش کرنے لگے تو ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے۔کسی نے فحش نگار کہا،تو کسی نے پاگل۔لیکن سچائی یہ ہے کہ منٹو ایک عظیم فنکار تھا اور وہ کسی ناانصافی کو قبول نہیں کرسکتا تھا۔نتیجتاً حقیقت کو تسلیم نہیں کرنے والوں کی نگاہ میں منٹو ایک باغی اور فحش نگار بن گیا۔لیکن ان کی بغاوت سچ معنی میں دم توڑتی انسانیت کے لئے ''کورامین'' ثابت ہوئی اور آج بھی ان کے افسانوں کی معنویت برقرار ہے۔کیوں کہ آج بھی ہمارے ملک میں فسادات کا چلن عام ہے اور طوائف کی جگہ کال گرل نے لے لی ہے۔

☆☆☆

مذہبِ انسانیت کا علمبردار۔ خواجہ احمد عبّاس

''میں ان تمام ہندوستانیوں سے محبت کرتا ہوں ۔ سب سے ہمدردی رکھتا ہوں، سب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اس لئے کہ وہ میرے ہم وطن ہیں، میرے ہم عصر ہیں ۔ میں اپنے افسانوں میں ان کے چہرے اور کردار کو دکھانا چاہتا ہوں ۔ نہ صرف اوروں کو بلکہ خود ان کو، انسان کو، سماج کو شیشہ دکھانا بھی ایک انقلابی فعل ہوسکتا ہے۔ چوں کہ خوش فہمی نہیں بلکہ اپنی ذات کو سمجھنا بھی بڑی سماجی اور نفسیاتی تبدیلیوں کو حرکت میں لا سکتا ہے''۔

(مجھے کچھ کہنا ہے۔ دیباچہ، ''نئی دھرتی نئے انسان'')

مذکورہ عبارت ہی میرے عنوان کا محور و مرکز ہے اور میں نے خواجہ احمد عبّاس کے انہی خیالات کی روشنی میں ان کے نظریۂ فن وحیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو خواجہ احمد عباس بہ یک وقت ایک افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، مکالمہ نویس، فلم ساز، صحافی اور کامیاب ایڈیٹر تھے۔ لیکن دنیائے اردو ادب میں ان کی شناخت کا ضامن ان کے افسانے اور ناول ہیں۔ اگرچہ وہ فلم سازی میں بھی نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور صحافت میں بھی اپنی نظیر قائم کی کہ ان کا '' آخری صفحہ'' آج بھی کالم نگاری کے باب میں گنج ہائے گراں مایہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا '' آخری

صفحہ'' نہ صرف اردو ادب کے قارئین کے لئے کشادگیِ ذہن کا سامان فراہم کرتا تھا بلکہ خود ان کے مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بھی تھا۔ جیسا کہ انہوں نے خود ہی لکھا تھا:

> ''مجھے کچھ کہنا ہے اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی ''بلیز'' میں آخری صفحہ اور آزاد قلم لکھ کر، کبھی دوسرے اخبار اور رسالوں کے لئے مضمون لکھ کر، کبھی افسانے کی شکل میں، کبھی ناول کی، کبھی ڈکومنٹری فلم بنا کر، کبھی دوسروں کی فلموں کی کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر، کبھی کبھی خود اپنی فلم ڈائرکٹ کر کے''۔ (انٹرویو۔ ''بلیز''، ممبئی)

غرض کہ خواجہ احمد عباس (۷/ جون ۱۹۱۴ء ۔ یکم جون ۱۹۸۷ء) ہر ممکن طریقے سے اپنی بات کہنا چاہتے تھے لیکن ان کی فکر ونظر کا محور ومرکز صرف اور صرف ''حبِ وطن'' اور ''تحفظِ انسانیت'' تھا۔ حقیقت پسندی ان کا ایمان تھا اور وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک ملک کے کروڑوں کمزور وناتواں عوام کی آزادی کے لئے جد وجہد کرتے رہے۔ ان کی فکر میں آزادی کا مقصد صرف ملک سے انگریزوں کو بھگا دینا نہیں تھا بلکہ وہ آزادی کا اصل مفہوم خوف وہراس، بھوک وافلاس اور ہر طرح کے ازم و استحصال سے نجات کو آزادی سمجھتے تھے۔ وہ انسانی ذہن اور زندگی کو بدلنے کے خواہاں تھے اور اس میں انہیں کامیابی بھی ملی۔ انہوں نے ہر ممکن طریقۂ اظہار کو اپنایا۔ فلم کے ذریعہ افسانہ نگاری، ناول نگاری اور صحافت نگاری کے ذریعہ نت نئے اور اچھوتے تجربے کئے۔ انہوں نے کبھی یہ سوچ کر قلم نہیں اٹھایا کہ میں بلند پایہ اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کروں۔ انہوں نے اپنی تحریروں کی فنی اور جمالیاتی قدر وقیمت کا فیصلہ آنے والی نسلوں پر چھوڑ دیا اور آج ہر انصاف پسند ناقد یہ کہنے پر مجبور ہے کہ وہ ایک تخلیقی ذہن کے فنکار تھے اور مذہبِ انسانیت کے علمبردار بھی۔

خواجہ احمد عباس افقِ ادب پر اس وقت نمودار ہوئے جب آسمانِ افسانہ پر کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی کی حیثیت نمایاں تھی۔ کرشن چندر کہانی کا جادوگر تو منٹو کہانی بُننے کا ماسٹر، بیدی اینٹ پر اینٹ جوڑنے کا والاتھیم کا بادشاہ تو عصمت پردے کے پیچھے کی عکاس اور چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ بنانے کی ماہر۔ یہ سب کے سب بڑے جدید افسانہ نگاروں کے طور پر نمایاں تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے خواجہ احمد عباس اپنے ان تمام ہم عصروں کی صف میں نہ صرف شامل ہوئے بلکہ سنجیدہ قارئینِ ادب کی نگاہوں میں معتبر بھی ثابت ہوئے۔ ان کی پہلی کہانی ''ماہنامہ جامعہ'' (۱۹۳۸ء) میں شائع ہوئی تھی جس کا عنوان ''ابابیل'' تھا۔ اس پہلی کہانی کو کتنی مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ جب جرمنی میں دنیا کے تمام زبانوں کی بہترین کہانیوں کا انتخاب شائع کیا گیا تو اس میں تین ہندوستانی کہانیاں شامل کی گئیں۔ اول ٹیگور کی دوسری ملک راج آنند کی اور تیسری ''خواجہ احمد عباس کی پہلی کہانی ''ابابیل''۔ یکے بعد دیگران کے گیارہ افسانوی مجموعے شائع ہوئے اور انہوں نے اپنی کہانیوں میں مکمل ہندوستان کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ہمیں ''ایک لڑکی'' سے روشناس کرایا ''زعفران کے پھول'' کی خوشبو دی، ''نیلی ساڑی'' میں لپٹی ہوئی زندگی کو دکھایا، ''گیہوں اور گلاب'' کی حقیقت بتائی، ''پیرس کی ایک شام'' کا نظارہ کرایا، بیسویں صدی کے ''لیلیٰ مجنوں'' کی شناخت بتائی اور ''نئی دھرتی اور نئے انسان'' کو ''ٹڈی'' سے ہوشیار رہنے کا سبق دیا۔ غرض کہ ان تمام کہانیوں کے کردار ہندوستان کی عوامی زندگی کے نمونے ثابت ہوئے اور ان کے چہرے پر جو برسوں کی ناکامیاں، مایوسیاں اور اداسیاں تھیں اس کی آئینہ داری کی۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے کرداروں کو ایک نئی راہ دکھائی، ایک نئی روشنی بخشی اور ان کے مایوس دل کو جینے کا حوصلہ بخشا۔ اپنے ایک کردار گوپال جو بے روزگاری کے دلدل میں پھنسا

تھا اس کے دل میں امید کی شمع جلائی اور تمام رنج وغم کو اٹھانے کا حوصلہ بخشا۔ وہ اپنی محبوبہ ''شیلا'' سے ایک دن کہتا ہے ''میں نے اپنی زندگی اپنے مستقبل کی خاطر حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیوں کہ انسان ستاروں کے سامنے اتنا بے بس نہیں جتنا میں سمجھتا ہوں'' اور پھر اپنے کردار دامو سے کہلواتے ہیں ''ابھی سارے ٹڈّی دل کا خاتمہ نہیں ہوا'' پھر بے زبان بھولی کو زبان دے کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں جب بھولی اپنے باپ سے کہتی ہے۔ ''پتا جی اٹھایئے اپنے پانچ ہزار مجھے اس سے بیاہ کرنا منظور نہیں''۔

غرض کہ خواجہ احمد عبّاس کے افسانوں میں خواص سے زیادہ عوامی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے اور ہر جگہ ظلم کے خلاف آواز کی بازگشت ہے۔ ان کے یہاں ایک صحت مند معاشرہ بنانے کی تلقین ہے۔ اردو کے ایک با اعتبار ناقد پروفیسر عبدالمغنی خواجہ احمد عباس کو اگر چہ صفِ اول کا افسانہ نگار تسلیم نہیں کرتے لیکن ان کے یہاں جو دردِ انسانیت ہے اس کے وہ معترف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو افسانہ نگاری کی دوسری صف میں خواجہ احمد عباس کی جگہ محفوظ ہے۔ انہیں انسانیت سے ہمدردی تھی، وہ کمزوروں، محروموں اور مجبوروں کی دادرسی کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں موجودہ سماج ناانصافیوں سے بھرا ہوا تھا اور اس ظلم وستم سے نجات کی صورت یہ تھی کہ ماحول میں ایک انقلاب ہو۔ اس انقلاب کا راستہ ہموار کرنے کے لئے انہوں نے فلم اور صحافت کے ساتھ ادب کے وسیلۂ اظہار سے کام لیا اور چند ایسی تخلیقات پیش کیں جنہیں پڑھ کر کچھ لطف اور کچھ سبق لیا جا سکتا ہے'' (خواجہ احمد عباس۔ ایک تنقیدی تاثر)

اور پروفیسر محمد حسن نے خواجہ احمد عباس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''خواجہ احمد عباس نے عظیم کہانیاں نہیں لکھیں، ان کے افسانوں اور ناولوں میں ایسا کوئی کردار نہیں جو مدتوں زندہ رہنے والا ہو مگر جو چیز ان کہانیوں کو شاید مدتوں بعد بھی پڑھے جانے کے قابل رکھے وہ ایک صحت مند معاشرہ کی پر خلوص تلاش ہے جو ان کی ہر سطر میں ملتی ہے''۔

(ایوانِ اردو، دہلی۔خواجہ احمد عباس نمبر۔شمارہ دسمبر ۱۹۸۷ء، ص:۴۶)

خواجہ احمد عباس ایک ترقی پسند تھے اور ترقی پسند روایت کے ایک بڑے علمبردار بھی۔لیکن وہ کسی کے مقلد نہیں تھے۔ان کی ڈگر الگ تھی، وہ ایک روشن خیال اور انسان دوست فنکار تھے۔کوئی بھی نظریہ جو انسان کی ترقی میں معاون ہو سکتا ہو اسے وہ قبول کر لیتے تھے۔دبے کچلے انسانوں کی بھوک، پیاس اور ظلم واستحصال کے خلاف احتجاج بلند کرنا ان کا مقصدِ حیات تھا۔یہ ان کی حب الوطنی کا جذبہ ہی تھا کہ وہ کمیونزم سے متاثر ہوتے ہوئے بھی گاندھی، نہرو، آزاد، خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر انصاری جیسے رہنمائے قوم کے خیالات کے حامیوں میں تھے اور ان کے فکر ونظر کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے میں کبھی جھجھک محسوس نہیں کی۔ظفر پیامی نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:

''خواجہ احمد عباس کی عظمت کی اساس فن کے کسی مفروضے یا سیاست کے کسی نظریے سے ان کی وابستگی نہیں تھی بلکہ بھری پری زندگی میں ان کی بھرپور دلچسپی تھی۔ان کی عظمت اسی میں تھی کہ انہوں نے ہندوستان سے بھرپور محبت کی اور اسے سارے جہاں میں سب سے اچھا سمجھتے ہوئے سب سے اچھا بنانے کی انتھک جدوجہد آخری عمر تک کی۔عظمتِ ہندوستان اور عظمتِ انسان

کی اس جدو جہد کو انہوں نے کبھی علاحدہ علاحدہ نہیں سمجھا۔
انہوں نے اس جدو جہد کے دوران نہ تو کبھی خود کو کسی نظریے کا
پابند بنایا اور نہ کسی گروہ کا سہارا لیا''۔
(ماہنامہ آج کل، دہلی۔خواجہ احمد عباس نمبر، دسمبر ۱۹۸۸ء ص:۱۰)

خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں کی طرح ناولوں میں بھی قومی یکجہتی کو اولیت دی۔ مثلاً مذہبی، لسانی، علاقائی، اقتصادی اور طبقاتی یکجہتی وہم آہنگی ان کے ناولوں میں زیریں لہروں کی طرح رواں دواں ہیں۔ اسی طرح ان کے ڈرامے بھی انسان دوستی اور حب الوطنی کے ترجمان ہیں۔انہوں نے کل پانچ ڈرامے۔''زبیدہ''، ''یہ امرت ہے''، ''میں کون ہوں''، ''اتیہاس اور ایٹم بم'' اور ''لال گلاب کی واپسی'' لکھے ہیں۔ ان تمام ڈراموں میں سماج کے دبے کچلے انسانوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔''میں کون ہوں'' یہ ڈرامہ ۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات اور ملک کی تقسیم کے بعد رونما ہونے والے واقعات پر لکھا گیا ہے۔ ڈرامہ کا ایک کردار جو ہندو پاک کی سرحد پر زخمی ہو کر بے ہوش ہو جاتا ہے اور جب اس کو ہوش آتا ہے تو اسے یاد نہیں رہتا ہے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ یہ منظر اتنا اثر انگیز ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے خونِ دل ٹپکنے لگتا ہے۔

ناول نگاری کے باب میں بھی خواجہ احمد عباس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ ''انقلاب'' جس پر تفصیلی گفتگو آگے ہوگی کے علاوہ انہوں نے مندرجہ ذیل ناول جہانِ ادب کو عطا کئے ہیں۔''چار دل چار راہیں، بمبئی رات کی بانہوں میں، میرا نام جوکر، سات ہندوستانی، دو بوند پانی، فاصلے، تین پیسے ایک پرانا ٹب دنیا بھر کا کچڑا، رقص کرنا ہے اگر، وغیرہ۔ لیکن اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ناول نگاری میں ''انقلاب'' ہی ان کی شہرتِ دوام کا ضامن ثابت ہوا ہے کہ ''انقلاب'' ان کا ایک

شاہکار ناول ہے۔ لیکن یہ قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے کہ ان کا یہ پہلا ناول سب سے آخر میں اردو زبان میں شائع ہوا۔ میرے خیال میں یہ اردو کا پہلا ناول ہے جو لکھا تو گیا اولاً اردو زبان میں لیکن شائع ہوا سب سے پہلے غیر ملکی زبان روسی میں۔ اس ناول کے ساتھ اس طرح کا معاملہ اس لئے درپیش رہا کہ یہ ناول بہت ضخیم تھا اور ہندوستان میں کوئی بھی ناشر اسے شائع کرنے کو تیار نہیں تھا۔ خواجہ احمد عباس جب 1954ء میں روس کے سفر پر گئے تو اس ناول کے مسودہ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ وہاں کے ادیبوں کو سنایا اور وہاں اسے بہت سراہا گیا۔ نتیجتاً یونین آف رائٹرس کی مدد سے یہ ناول 1955ء میں بہ زبان روسی ''سن ان دی'' (ہندوستان کا بیٹا) کے نام سے شائع ہوا۔ اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں اس کا پہلا ایڈیشن ۹۰ رہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہاں کی مختلف علاقائی زبانوں میں بھی شائع ہوا۔ جرمن اور لاطینی زبانوں میں شائع ہونے کے بعد ہندوستان میں ۱۹۵۶ء میں انگریزی میں اور پھر ۱۹۶۱ء میں ہندی میں شائع ہوا۔ یہ ایک المیہ ہی ہے کہ اردو میں یہ ناول 1975ء میں شائع ہوا اور وہ بھی کسی ناشر نے نہیں خود مصنف نے اپنے خرچ پر شائع کرایا۔

خواجہ احمد عباس کا ناول ''انقلاب'' پریم چند کے ناول ''گئودان'' اور قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کی طرح بڑے کینوس کا ناول ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اردو ادب میں عباس کے اس شاہکار کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی اور اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو ''گئودان'' اور ''آگ کا دریا'' کو حاصل ہے۔ جب کہ جدید ناول نگاری میں یہ ناول ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

موضوع کے لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کا ایک تاریخی ناول ہے۔ جس میں ملک کی جنگِ آزادی اور اس کے دوران رونما ہونے والے واقعات کو دلکش اور مؤثر انداز

میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول چار حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ ''بادل گھر آتے ہیں'' دوسرا حصہ ''طوفان کی آمد آمد'' تیسرا حصہ ''بادل کی گرج، بجلی کی کڑک'' اور چوتھا حصہ ''طوفان اور طوفان کے بعد'' عنوانات پر مشتمل ہے۔ جنگِ آزادی اس ناول کا پس منظر ہے۔ سائمن کمیشن کی مخالفت، گاندھی جی کا ستیہ گرہ، ڈانڈی مارچ، بھگت سنگھ کا اسمبلی میں بم پھینکنا، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی شوکت، شوکت علی کی سیاسی سرگرمیاں، کانگریس کے اجلاس اور جلیاں والا باغ کے قتل عام کی عکاسی بڑی ہی چابک دستی کے ساتھ کی گئی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار انور ہے جو خواجہ احمد عباس کا آئیڈیل ہے۔ انور کے علاوہ انجم، سلمہ، اکبر علی، رامیشور دیال بھی ناول کے اہم کردار ہیں۔ ان کرداروں کے علاوہ جنگِ آزادی کے لیڈران مہاتما گاندھی، سبھاش چندر بوس، سروجنی نائیڈو، خان عبد الغفار خاں، پنڈت نہرو، مولانا شوکت علی، محمد علی اور راجا گوپال آچاریہ سے بھی قاری کی جگہ بہ جگہ ملاقات ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس ایک کمیونسٹ تھے اس لئے اس میں انہوں نے مارکس کو بھی پیش کیا ہے اور مارکسی نظریے کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ پورا ناول ہندوستان کی جنگِ آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اس لئے ناول میں اس وقت کے سیاسی حالات کی ہو بہو تصویر کشی کی گئی ہے۔ امرتسر کے جلیاں والا باغ کے قتلِ عام کے واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے:

> ''شام کے چار بجے جلیاں والا باغ میں جلسہ منعقد ہوا بیس ہزار لوگوں کے انقلاب زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ تھوڑی دیر بعد ۳۰۔۴۰ انگریز اور گورکھا سپاہیوں کا ایک دستہ آ کر باغ کے پھاٹک کے سامنے تعینات ہو گیا..... پھر اس لال منہ والے آفیسر نے حکم دیا ''فائر'' اور گورکھوں نے گولی چلانا شروع

کردیا۔ گولیوں کی بوچھار ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکی۔ مرد، عورتیں اور بچے چاروں طرف گولیوں کا شکار ہو کر گر رہے تھے۔ دم توڑتے ہوئے اور زخمی لوگوں کی گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے بیچ ''یااللہ''، ''ہے بھگوان'' اور ''اے میری ماں'' کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جلیاں والا باغ پر موت کا سناٹا چھا گیا چاروں طرف زمین پر لاشیں اور زخمی جسم پڑے تھے جیسے گیہوں کی فصل کاٹ دی گئی ہو''۔

شہید بھگت سنگھ نے جس دلیری کے ساتھ اسمبلی میں بم پھینکا تھا اس واقعہ کو خواجہ احمد عباس یوں پیش کرتے ہیں:

''.....ایک بم سرکاری آفیسروں کے سامنے گرا اور بھیانک دھماکوں کے ساتھ پھٹ گیا.... انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد! یہ ایک مونچھوں والے نوجوان کی آواز تھی جو ایک کرسی پر نڈر کھڑا تھا۔ ایک پورے سامراج کے خلاف ایک اکیلا آدمی اور وہ......وہ نعرہ لگا رہا تھا جو پورے ملک کے لئے جدوجہد کی للکار بننے والا تھا۔ بعد میں جب پولیس کے ایک داروغہ نے اس کا نام پوچھا تو اس نے فخر سے جواب دیا بھگت سنگھ اس کی مونچھوں میں اب بھی بغاوت کا بانکپن تھا''۔

چوں کہ یہ ناول حصولِ آزادی کی تاریخ ہے اس لئے اس میں سیاسی واقعات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن اس میں سیاسی اور تاریخی واقعات کے علاوہ سماجی حالات کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سماجی برائیوں پر سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ مثلاً کم عمری کی شادی، امیروں کی عیش پرستی، مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ فسادات کا

کون۔پھر اس کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے تو ہمارے نقادوں کی عاقبت ہی خراب کر دی کہ اردو تنقید مغربی تنقید کا چربہ بن کر رہ گئی۔مشرقی فکر ونظر کو ہیچ جانا گیا اور مغربی نظریے کی وکالت کو ایمان سمجھا جانے لگا۔لیکن اس دورِ کشاکش میں بھی چند ایسے صحت مند فکر ونظر کے نقاد ابھرے جنہوں نے اپنے خونِ دل سے شجرِ نقد کی آبیاری کی اور جس سے اردو تنقید ثمر آور ہوئی ہے اس لئے عہدِ حاضر میں کئی ایسے نقاد سامنے آئے ہیں جن کی تحریریں چراغِ راہ ثابت ہوئی ہیں۔

قارئین حضرات! راقم الحروف کے مذکورہ نظریۂ نقد کی روشنی میں آپ ''احتسابِ فکر ونظر'' کا جائزہ لیجئے اور اپنی آرا کا اظہار کیجئے کہ آپ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی دونوں میرے لئے راہنما ثابت ہوگی۔

☆ڈاکٹر مشتاق احمد

ذکر بھی بڑے عبرتناک ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔ ناول کے ہیرو انور کی بہن انجم کی شادی کم عمری میں ہو جاتی ہے اور وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ اس المیہ کا نقشہ عباس نے یوں پیش کیا ہے:

> ''بہت کم عمری میں اس کی شادی کر دی گئی تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں بچہ ہونا ہی نہیں چاہئے۔ یہ تو جان بوجھ کر مار ڈالنا ہے، جہالت ہے، بلا کی جہالت ہے۔ نہ جانے کتنی عورتوں کی جان اس میں جاتی ہے''۔

فرقہ وارانہ فسادات کے المناک منظر کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> ''پتہ چلا کہ شہر کے دو غنڈوں میں کوئی ذاتی جھگڑا ہو گیا ان میں ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان۔ دونوں طرف کے کٹر مذہبی لوگوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جھوٹی افواہیں پھیلائی تھیں اور دونوں فرقوں کے بیچ جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔ جو کل تک آپس میں بھائی بھائی اور دوست تھے وہ آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد فساد تو ختم ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے دلوں میں جو دشمنی پیدا ہو گئی تھی وہ دور نہیں ہوئی!!''

اس ناول کو ایک خودنوشت بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں خواجہ احمد عباس کی ذاتی زندگی، ان کے مذہبی و سیاسی افکار اور ادبی نظریات کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناول میں عباس کا انقلابی شعور پوری طرح غالب نظر آتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے عباس کے تصورِ حیات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ سیاسی رہنما گاندھی، نہرو، سروجنی نائیڈو، خان عبدالغفار خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور شوکت علی کے شخصی خاکے نے اس ناول کو سوانح کے عنقریب کر دیا ہے۔ اس ناول کے مطالعہ سے صرف جنگِ

آزادی کی تاریخی وسیاسی حالات سے ہی واقفیت نہیں ہوتی بلکہ ہندوستان کے سماجی اور معاشرتی زندگی کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔غرض کہ خواجہ احمد عباس نے ناول ''انقلاب'' کے پیرائے میں ہندوستان کے سیاسی ،سماجی اور معاشرتی حالات کے موضوع کوتاریخی پسِ منظر میں نیا مزاج وآہنگ عطا کیا ہے۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ صحافت خواجہ احمد عباس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ جو بات افسانے ،فلم ،ناول اورڈراموں میں نہیں کہہ پاتے تھےان تمام باتوں کو کہنے کے لئے'' آخری صفحہ'' کا سہارا لیتے تھے۔ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ''بمبئی کرونیکل'' سے ہوا تھا پھر وہ ''بلیز'' سے وابستہ ہوئے اور آخری سانس تک بلیز میں ''آخری صفحہ'' لکھتے رہے۔اپنی چالیس سالہ صحافتی زندگی میں انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ تاریخی اور قومی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہے۔

خواجہ احمد عباس کوفلموں سے الگ کر دیکھنے کا مطلب ہوگا کہ ان کی زندگی کے ایک رخ پر پردہ ڈالنا کیوں کہ وہ ایک کامیاب فلم کہانی کار تھے اور ڈائرکٹر بھی۔ان کی فلمی کہانیوں میں ''نیا سنسار''،''ڈاکٹر کوٹنش کی امر کہانی''، ''آوارہ''''سری 420''،''میرا نام جوکر''،''بابی''،''رام تیری گنگا میلی''اور''حنا'' قابلِ ذکر ہیں اور جب ان کو یہ محسوس ہوا کہ ان کی فلمی کہانیوں کے ساتھ ڈائرکٹر اچھا برتاؤ نہیں کر رہے ہیں تو انہوں نے خود ہی فلم ڈائرکٹ کرنے کا فیصلہ لیا اور پروڈیوسر بھی بنے۔جیسا کہ انہوں نے''بلیز'' کے آخری صفحہ میں اعتراف کیا تھا:

> ''میں تو دراصل فلموں میں کہانیاں لکھنے آیا تھا۔ جب دیکھا کہ ڈائرکٹر کہانی کو مسخ کر دیتا ہے،فلم بناتے وقت تو میں نے طے کیا کہ خود ڈائرکٹ کروں گا لیکن ڈائرکٹر بننے کے باوجود محسوس ہوا

کہ پروڈیوسر دخل و معقولات کرتا ہے تو پھر میں نے خود پروڈیوسر بننے کا تہیّہ کیا''

واضح ہو کہ خواجہ احمد عباس نے تقریباً ایک درجن فلمیں ڈائرکٹ کی ہیں۔ ان میں ''دھرتی کے لال''، ''راہی''، 'شہر اور سپنا''، ''آسمانی محل''، ''بمبئ رات کی بانہوں میں''، ''چار دل چار راہیں''، ''سات ہندوستانی''، ''دو بوند پانی''، ''ہمارا گھر'' اور ''نکسلائٹ'' قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی بیشتر فلمیں ناکام ہوئیں۔ میری سمجھ سے ناکامی کی ایک اہم وجہ ان فلموں کا سنجیدہ موضوع اور فلمی روش سے انحراف تھا۔ انہوں نے اپنی فلموں میں بھی کسی نہ کسی اہم سماجی اور عصری مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی اور فلمی تکنیک میں تجربے بھی کئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی فلمیں عوام میں وہ مقبولیت حاصل نہ کرسکیں جن کی وہ حقدار تھیں۔ پھر بھی سنجیدہ ذہن کے لوگوں نے ان کی فلم سازی کا اعتراف کیا اور ان کی فلم ''شہر اور سپنا'' کو پرسیڈنٹ ایوارڈ بھی ملا جب کہ ''ہمارا گھر'' کو اسپین، چیکوسلواکیہ اور امریکہ میں فلمی ایوارڈ سے نوازا گیا تو ''نکسلائٹ'' کو اٹلی فلم انڈسٹری نے ایک اہم فلم قرار دے کر ایوارڈ عطا کیا۔

مختصر یہ کہ خواجہ احمد عباس ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور ان کی شخصیت کا ہر پہلو روشن تھا۔ یہاں میں ان کے کارناموں محض سرسری نظر ڈالی ہے اور اس مختصر مطالعے سے بھی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ خواجہ احمد عباس ایک تخلیقی فنکار تھے اور ان کے افکار و نظریات کا محور و مرکز فلاح و بہبودِ بشر تھا۔

☆☆

پروفیسر وہاب اشرفی۔ کچھ یادیں کچھ باتیں

۱۵/جولائی ۲۰۱۲ء کی صبح کے چار بج کر چوالیس منٹ اور نو سکنڈ ہوئے تھے کہ میرے موبائل پر ایک میسیج آیا۔حسبِ معمول اس طرح کے میسیج کو میں فوراً نہیں دیکھتا لیکن نہ جانے کیوں اس میسیج کو میں نے فوراً پڑھنے کی کوشش کی۔لکھا تھا ''پروفیسر وہاب اشرفی آج تین بجے انتقال فرما گئے **انا للہ وانا الیہ راجعون** ''(ڈاکٹر موصوف)۔میرا ذہن اس ٹھوس سچائی کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا کیوں کہ گذشتہ دو سالوں سے اکثر اس طرح کی خبریں دوست احباب سے ملتی رہتی تھیں کہ اب وہاب صاحب چند دنوں کے اور چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔لیکن دوسرے ہی دن اخباروں میں یہ خبر پڑھنے کو ملتی تھی کہ پروفیسر وہاب اشرفی نے فلاں ادبی جلسہ سے خطاب فرمایا، یا پھر صدارت کی۔ابھی میرا ذہن اسی ہاں اور ناں میں الجھا ہوا تھا کہ پانچ بج کر دو منٹ پر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا کال آیا بس بات وہی تھی کہ پروفیسر وہاب اشرفی اب نہیں رہے۔ظاہر ہے اب اس ٹھوس سچائی کو قبول نہ کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔میں نے بھی اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔پھر بیگم کو آواز دی اور اس سانحہ کی خبر دی۔چوں کہ پروفیسر وہاب اشرفی ان کی پی۔ایچ ڈی کے ایک ممتحن تھے اور انہوں نے ہی وائیوا لیا تھا اس لئے وہاب اشرفی صاحب کے لئے ان کے دل میں نہ صرف احترام ہے بلکہ وہ ان کی تحریروں کو ہمیشہ پڑھنے کی کوشش میں رہتی ہیں۔اب ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر

پروفیسر وہاب اشرفی کے ذکر خیر میں مشغول تھے کہ ڈاکٹر ہمایوں اشرف صاحب کا میسج آیا۔ ''انتہائی غم کے ساتھ یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ رات تین بجے وہاب اشرفی صاحب انتقال فرما گئے'' میں نے فوراً رِنگ بیک کیا۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی آواز بھاری تھی اور میری آنکھیں بھی آبدیدہ۔ ہم دونوں بس ان کی موت کو ذاتی غم کے طور پر لے رہے تھے اور کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس بات سے دل کو اور بھی صدمہ پہنچا کہ بقول ڈاکٹر ہمایوں اشرف اسی دن انہیں میرے رسالہ ''جہانِ اردو'' کا تازہ شمارہ ملا تھا اور انہوں نے میری خیریت دریافت کی تھی۔ واضح ہو کہ میں اپنے ایک دفتری امور کی میٹنگ کے لئے مورخہ ۱۳؍ جولائی ۲۰۱۲ء کو پٹنہ گیا تھا اور ''جہانِ اردو'' کا یہ شمارہ ان کے لئے بک امپوریم پر چھوڑ آیا تھا۔ چوں کہ اس دن جمعہ کے بعد میٹنگ تھی اور یہ میٹنگ تقریباً سات بجے شام میں ختم ہوئی اس لئے میں چاہ کر بھی پروفیسر وہاب اشرفی صاحب سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ جب کہ پہلے کبھی پٹنہ جانا ہوتا تھا تو ان سے ملنے کے لئے ضرور جاتا تھا اور ان سے کچھ حاصل کر کے واپس آتا تھا۔ لیکن اسے میری بدنصیبی ہی کہا جائے کہ اس دن ان کا نیاز حاصل نہیں ہو سکا اور اب تو صرف ان کی یادیں ہی یادیں رہ گئی ہیں۔ بشیر بدر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ؎

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

پروفیسر وہاب اشرفی کا نام میں نے پہلی بار کب سنا تھا وہ تو ٹھیک سے یاد نہیں لیکن انہیں پہلی بار دیکھنے کا موقع ۱۹۸۲ء میں ملا تھا جب میں ایک نجی تقریب میں رانچی گیا تھا اور اس تقریب میں پروفیسر وہاب اشرفی موجود تھے۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اپنا تعارف پیش کیا تھا اس وقت تک میرے بس تین چار مضامین اخبار و رسائل میں شائع ہوئے تھے اور چند افسانے غیر ادبی پرچوں میں چھپے تھے لیکن پہلی ہی

ملاقات میں انہوں نے مجھ پر جو شفقت وخلوص کی بارش کی تھی وہ آخر تک جاری رہی اس ملاقات کے بعد میں بھی پروفیسر وہاب اشرفی کی تحریر کو سنجیدگی سے پڑھنے لگا تھا اور ان کی تنقیدی بصیرت وبصارت سے اپنے تاریک ذہن کو روشن کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر جب وہ پٹنہ آ گئے اور بہار یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیر مین مقرر ہوئے تو اکثر یہاں کبھی ادبی جلسوں میں اور کبھی سیاسی گلیاروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ دیکھتے ہی میں سلام عرض کرتا اور پروفیسر وہاب اشرفی صاحب جواب کے ساتھ خیریت پھر لکھنے پڑھنے کے متعلق سوالات کرتے۔ ان کے سوالات میں جو ہمدردی اور اپنا پن ہوتا تھا اس کی مثال اردو ادیبوں میں بس پروفیسر قمر رئیس تھے کہ ان سے بھی جب کبھی ملاقات ہوتی تو اسی طرح شفقت سے ملتے اور اپنے نیک مشوروں سے نوازتے۔ ادھر جب کبھی میرا مضمون اخبار رسائل میں چھپتا تو مرحوم نہ صرف اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے بلکہ خامیوں کی طرف بھی اشارہ کرتے۔ البتہ ایک بات اکثر کہتے تھے کہ عصری حالات پر آپ کی نگاہ اچھی ہے لیکن خود کو ادب تک محدود رکھئے تو بہتر ہے۔ وہ میری حوصلہ افزائی کرتے اور کہتے کہ آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ میں اس حقیقت کو خوب سمجھتا تھا کہ وہ میری ہمت افزائی کر رہے ہیں ورنہ میری تحریر ان جیسے دانشور کے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ میں کبھی کبھار ادبی مسائل کے تعلق سے انہیں فون کیا کرتا تھا اور فون پر ہی وہ میرے مسائل حل کر دیا کرتے تھے۔ کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میرا فون انہیں بارِ گراں گزرا ہو بلکہ اکثر خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے اور دعاؤں سے نوازتے تھے کہ آپ کی نسل میں تو لوگ ایک دو صفحہ لکھنے کے بعد خود کو استاد سمجھنے لگتے ہیں اور آپ ماشاء اللہ لکھ پڑھ رہے ہیں اور آپ کے اندر سوال کرنے کی عادت موجود ہے۔ اس سلسلہ کو جاری رکھئے کہ علم کے معاملے میں یہ عادت انسان کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتی ہے۔ اس طرح کا سلوک اپنے چھوٹوں سے

صرف اور صرف وہاب اشرفی ہی کرتے تھے۔ایک واقعہ یہاں تحریر کرنا چاہتا ہوں اس معذرت کے ساتھ کہ اسے میری تعلّی نہ سمجھا جائے۔ پروفیسر وہاب اشرفی صاحب جب ''تاریخِ ادب اردو'' مکمل کر رہے تھے تو پٹنہ کی ایک تقریب میں مجھ سے ملاقات ہوئی وہ دیکھتے ہی مجھے ڈانٹنے لگے'' آپ کو خبر بھجوائی تھی کہ آپ اپنی تفصیلات مجھے بھیج دیں لیکن آج تک نہیں ملی۔اب میں کام سمیٹنے والا ہوں۔''میں نادم تھا کیوں کہ جناب عطا عابدی صاحب نے ایک ماہ قبل ہی یہ اطلاع دی تھی کہ پروفیسر وہاب اشرفی کا حکم ہوا ہے کہ میں انہیں اپنے متعلق مختصراً تحریر کر جلد سے جلد بھیج دوں۔لیکن سچائی یہ ہے کہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھ رہا تھا کہ تاریخِ ادب اردو میں میری شمولیت ہو سکے۔میں نے سمجھا کہ پروفیسر اشرفی میری حوصلہ افزائی کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں اس لئے میں ٹالتا چلا گیا لیکن اس دن پٹنہ میں جب ان کی محبت بھری ڈانٹ ملی تو میں نے ان سے وعدہ کیا کہ بس دو چار دنوں میں بھیج دوں گا۔ابھی بس دوسرا ہی دن تھا کہ ان کا فون آیا ''دیکھئے اب میرے پاس وقت نہیں ہے آپ لکھایئے جو کچھ لکھانا چاہتے ہیں آج میں ''تاریخِ ادب اردو'' کا یہ باب ختم کر رہا ہوں لیجئے فون پر ان کو اپنی تفصیلات لکھوایئے''۔اُدھر سے آواز بھائی عطا عابدی کی تھی'' آج آپ کو لکھانا ہی ہوگا'' اور میں نے بھی اس وقت جو کچھ سمجھ سکا انہیں لکھوا دیا اور جب'' تاریخِ ادب اردو'' شائع ہوئی تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میں نے تو بس اپنی تاریخِ پیدائش ،وجائے مقام اور کتابوں کے نام لکھوائے تھے لیکن انہوں نے اس حقیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف میرے لئے باعثِ فخر ہے بلکہ سند کا درجہ رکھتا ہے۔میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ''تاریخِ ادب اردو'' میں جگہ بہ جگہ کتابت کی غلطی کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے کہا اطمینان رکھئے جلد ہی اغلاط نامہ پر مشتمل جلد آرہی ہے۔آپ خان صاحب کے یہاں سے لے لیں گے اور واقعی کچھ دنوں کے بعد تصحیح شدہ جلدیں شائع

ہوئیں۔ یہ کتاب نہ صرف ان کے لئے تاریخی اہمیت کی حامل ثابت ہوئی کہ 2010ء میں اسی کتاب پر انہیں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا بلکہ جہانِ ادب کے قارئین کے لئے بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ پہلی بار زیادہ سے زیادہ نو واردانِ ادب کے احوال وکوائف کو اس میں جگہ دی گئی ہے۔ ہاں مجھے اس کا بات ہمیشہ افسوس رہے گا کہ حال ہی میں جب ''جشنِ وہاب اشرفی'' کا اہتمام پٹنہ میں کیا گیا تھا تو میں اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے اس میں شامل نہیں ہو سکا تھا بعد میں جب جشن کی کامیابی پر انہیں مبارکباد دی تھی تو قدرے ناراض بھی ہوئے تھے کہ میں اس میں شامل نہیں ہو سکا لیکن ایک دو دن کے بعد ہی انہوں نے حسبِ معمول میرے ایک عصری مضمون پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ جشنِ وہاب کے مضامین کتابی صورت میں شائع ہوں گے آپ نے اگر لکھا تھا تو اسے بھیج دیجئے۔ میں نے کہا کہ مضمون بس تاثراتی ہے اور ادھورا بھی، مکمل کر کے جلد ہی بھیج دوں گا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا مضمون مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے آخری سفر کو روانہ ہو جائیں گے۔ یوں تو پروفیسر وہاب اشرفی پر لکھی جانے والی کوئی بھی تحریر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی کیوں کہ ان کا ذخیرۂ ادب اوروں کی طرح بس رطب ویابس کا انبار نہیں ہے بلکہ ان کی ہر تحریر گنجینۂ معانی کا درجہ رکھتی ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی کی شخصیت کے تعلق سے علامہ اقبالؔ کا یہ شعر بہت موزوں معلوم پڑتا ہے کہ ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ان کی خودنوشت ''قصہ بے سمت زندگی کا'' ورق ورق الٹتے جائیے اور یہ حقیقت اجاگر ہوتی چلی جائے گی کہ وہاب اشرفی جو کچھ تھے وہ بس اپنی محنت اور اپنی

موہنی شخصیت کی بدولت تھے۔اس خودنوشت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہاب اشرفی کو وہاب اشرفی ہونے تک کتنی جدو جہد کرنی پڑی تھی، کن کن مشکل حالات سے وہ گزرے تھے۔کبھی اپنوں نے منہ پھیرا تو کبھی دوستوں نے ریاکاری کی۔لیکن ان کے اندر بلا کا حوصلہ تھا۔ وہ کبھی گھبرائے نہیں اور یقین محکم وعمل پیہم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور دنیائے ادب کے فاتح ثابت ہوئے۔ یہ ان کا مستحکم قوتِ ارادی اور حوصلہ ہی تھا کہ وہ بیماری کے دنوں میں بھی دور دراز کا سفر کرتے تھے اور ادبی جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ اکثر تو ایسا بھی ہوا کہ آج وہ صبح میں ہسپتال سے باہر آئے اور شام میں ادبی جلسوں میں شرکت کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے کالج یعنی ملّت کالج، دربھنگہ میں سمینار ہونا تھا۔تاریخ طئے ہوچکی تھی اس سمینار کے وہ خصوصی مہمان تھے لیکن متعینہ تاریخ کے ایک دن قبل یہ اطلاع ملی کہ پروفیسر وہاب اشرفی صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے اور وہ اسپتال میں داخل ہو گئے ہیں ۔ میرے تو ہوش وحواس اڑ گئے۔ میں نے خیریت کے لئے فون کیا۔اُدھر سے آواز آئی ''میں اسپتال میں ہوں انشاءاللہ شام تک گھر واپس آؤں گا اور کل آپ کے جلسے میں رہوں گا''۔ میں نے کہا کہ خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن اگر آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو رسک نہیں لیجئے گا سڑک کا سفر ہے۔وہ بولے'' آپ فکر مت کیجئے بس میں وہاں رات میں رکوں گا نہیں فوراً واپس آؤں گا میرے ساتھ شفیع جاوید صاحب بھی ہوں گے''۔ یہ واقعہ فروری ۲۰۱۰ء کا ہے اور سچ مانئے پروفیسر وہاب اشرفی ملّت کالج کے سمینار میں نہ صرف شامل ہوئے بلکہ اس موقع پر انہوں نے جو عالمانہ ودانشورانہ تقریر کی تھی اس کا لفظ لفظ کانوں میں رس گھول رہا ہے اور اس سمینار میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے آنے والے مقالہ نگاروں نے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہاب اشرفی صاحب کی آج کی تقریر نہ صرف عالمانہ ہے بلکہ بصیرت افروز اور سبق آموز بھی ہے۔

مختصر یہ کہ اردو کے نامور ناقد اور دانشور پروفیسر وہاب اشرفی (۲/جون ۱۹۳۶ء۔۱۵/جولائی ۲۰۱۲ء) علمی وادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ایک معلمِ اردو ہونے کے علاوہ ایک ادیب، افسانہ نگار، محقق، ناقد اور ادبی صحافت کے عظیم علم بردار تھے۔ پروفیسر اشرفی بنیادی طور پر اردو کے ایک مخلص معلم تھے، درس وتدریس کی دنیا میں ان کا تعلق ریاست کی مختلف یونیورسیٹیوں سے تقریباً تین دہائیوں تک رہا۔ انہوں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز مگدھ یونیورسٹی، گیا کے گیا کالج میں اردو لکچرار کی حیثیت سے کیا تھا اس کے بعد وہ رانچی یونیورسٹی، رانچی میں بحیثیت ریڈر مقرر ہوئے اور وہیں سے بحیثیت پروفیسر سبکدوش ہوئے۔ ان کی عملی زندگی بہت کامیاب رہی ۔ درس وتدریس کے بعد انہوں نے بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اسے تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔ پھر انہوں نے بحیثیت چیرمین، بہار انٹرمیڈیٹ کونسل جو انقلابی کارنامے انجام دیئے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ دنیائے ادب میں ان کا مرتبہ کتنا بلند و عظیم المرتبت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اساتذہ اور معاصرین نے بھی ان کی علمی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے۔ وہاب اشرفی کی تحریروں میں جو وسعت، ہمہ گیری اور گہرائی ہے اس کی بنیاد پر اردو انتقادی ادب میں ان کی اپنی ایک منفرد و مستحکم شناخت ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کی تحقیقی وتنقیدی کتابوں کے مطالعے سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ انہوں نے شروع سے ہی اپنی تحریروں کو صحت مند فکر ونظر کا آئینہ بنایا۔ ان کے تحقیقی مقالے ہوں یا تنقیدی مضامین، تاثراتی مضامین ہوں یا تبصرے ہر جگہ ان کے ذہن کی زرخیزی اور تنقیدی بصیرت وبصارت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ساتھ ہی ان کا اپنا ایک اسلوب ہے جو انہیں دوسروں سے نہ صرف منفرد کرتا ہے بلکہ ممتاز بناتا ہے۔ غرض کہ بیسویں صدی کی

سر سید احمد کی عصری معنویت

تاریخِ ہند کے اوراق شاہد ہیں کہ یہاں ہر عہد میں ایسے ایسے مذہبی، سماجی اور سیاسی مصلح و مفکر پیدا ہوئے ہیں جن کے افکار و نظریات سے نہ صرف ملک کی جغرافیائی تصویر بدلی ہے بلکہ قوم کی تقدیر بھی بدلی ہے۔ ویسے ہی عظیم مصلح و مفکر کی فہرست میں سر سید احمد خاں کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے افکار و نظریات نے ایک عہد کو متاثر کیا ہے اور ان کے حکیمانہ خیالات نے ہماری تاریک راہوں کو روشن کی ہیں۔ ان کی زندگی اور خدمات کا سرسری مطالعہ بھی اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کی نشو و نما میں جو قوتیں ایک مستقل محرک کے طور پر کام کرتی رہی ہیں ان میں سب سے اہم ہندوستانی قوم کی تعلیمی، سماجی اور سیاسی مسائل سے مستقل وابستگی رہی ہے۔ خواہ دہلی کی زندگی ہو کہ مراد آباد کے ایام، بجنور اور غازی پور کی صبح و شام ہو کہ علی گڑھ کے روز و شب، ان کی فکر کا محور اور مرکز صرف ہندوستانی قوم کی زندگی رہی ہے۔

اس تمہید کے بعد میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سر سید احمد خاں کی شخصیت اور خیال و نظریات کے موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس میں کوئی نئے پہلوؤں کی گنجائش باقی نہیں۔ کیوں کہ پیش پا افتادہ مضامین کے انبار سے استفادہ کر کے مضامین کے اعداد و شمار میں اضافہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی نئی بات یا پھر چونکانے والی بات مشکل سے کہی جا سکتی ہے۔ لیکن میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنے

آخری تین دہائیوں کے اردو تنقیدی و تحقیقی سرمایے کا جائزہ لیتے ہیں تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے جن ناقدینِ ادب نے اردو تنقید کو نئی سمت و جہت عطا کی اور اپنی صحت مند فکر و نظر سے آراستہ کیا ان میں پروفیسر وہاب اشرفی کا مقام نمایاں ہے۔ ان کی چار درجن تحقیقی و تنقیدی تالیفات و تصنیفات اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ زبان و ادب کے پودے کی آبیاری میں صرف کیا ہے۔ ان کی تصانیف و تالیفات میں ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' (۷ر جلدیں)، ''تاریخ ادب اردو'' (تین جلدیں)، ''قطب مشتری کے تنقیدی جائزے''، ''جدید ادبی تنقید''، ''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری''، ''معانی کی تلاش''، ''مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ''، ''کاشف الحقائق''، (ترتیب متن مع مقدمہ)، ''سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے''، ''پطرس اور ان کے مضامین''، ''راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری''، ''تفہیم البلاغت''، ''بہار میں اردو افسانہ نگاری''، ''آ گہی کا منظر نامہ''، اردو فکشن اور تیسری آنکھ''، ''مابعد جدیدیت: ممکنات و مضمرات''، ''مجروح سلطانپوری''، ''معنی کی جبلت''، ''مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب''، اور ''مشرقی و مغربی شعریات'' وغیرہم ریفرنس بک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی خود نوشت ''قصہ بے سمت زندگی کا'' اور تبصرے و تقاریظ کا مجموعہ ''نقطہ نقطہ تعارف'' کے علاوہ ان کے خطبات و تقاریر ان کے نظریۂ زندگی و ادب کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔ ادبی صحافت کے باب میں بھی ان کی حیثیت سنگِ میل کی ہے کہ انہوں نے ''صنم'' اور ''مباحثہ'' جیسے معیاری ادبی رسالوں کی ادارت کی اور پھر شروع کے دنوں میں ''عصرِ جدید'' (کلکتہ) سے بھی وابستہ رہے۔ ''آہنگ'' اور ''مورچہ'' (گیا) سے بھی وابستگی رہی۔ یوں تو حیات میں ہی ان کی علمی و ادبی خدمات کا چہار سمت اعتراف کیا گیا اور انہیں مختلف ادبی اداروں نے اپنے پر وقار انعام و اکرام سے نوازا جن میں ساہتیہ

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اکادمی، دہلی کا 2010ء کا ایوارڈ بھی شامل ہے۔اب ضرورت اس بات کی ہے کہ پروفیسر وہاب اشرفی کی ہمہ جہت شخصیت اوران کے افکار ونظریات سے نئی نسل کو آگاہ کرانے کے لئے ان کی شخصیت وفن پر سمینار، مذاکرے منعقد کرائے جائیں اوران کی ہمہ جہت شخصیت کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی جائے کہ ان کی شخصیت کا ہر ایک پہلو آنے والی نسل کے لئے مشعلِ راہ کا درجہ رکھتا ہے۔مرزا غالبؔ نے ایسے ہی نابغۂ روزگار شخصیت کے لئے شاید کہا تھا کہ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

☆☆☆

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی۔ناقد و محقق

اردو زبان وادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کا اسمِ گرامی نا آشنا نہیں ہے اور نہ ان کی ادبی خدمات کسی تعارف کی محتاج ہے۔کیوں کہ پروفیسر ہاشمی اپنی ہمہ جہت فعال شخصیت اور تعمیری افکار و نظریات سے تقریباً پانچ دہائیوں تک افقِ ادب پر کسی نہ کسی طور پر نمایاں اور روشن رہے۔اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے انہوں نے اپنے اساتذہ کے دلوں میں جگہ بنائی تو اپنے ہم عصروں کے چہیتے بھی رہے۔60ء سے 70ء تک پٹنہ یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت سے نہ صرف یونیورسٹی میں اپنی شناخت مستحکم کی بلکہ پٹنہ کی ہر ایک ادبی مجلس کی کامیابی کے ضامن سمجھے جاتے تھے۔پروفیسر لطف الرحمٰن، قمر اعظم ہاشمی اور جناب شبیر احمد تینوں ہم جماعت تھے اور تثلیث شخصیت اپنی علمی فتوحات کی وجہ سے ہر طبقے میں مقبولِ عام تھی۔واضح ہو کہ وہ زمانہ اردو کے لئے ایک سنہرا زمانہ تھا۔اساتذہ میں پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر جمیل مظہری، پروفیسر عطاء کاکوی، پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبد الودود، سید حسنین، پروفیسر اختر قادری، رضا نقوی واہی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر وغیرہم جیسے ناموران دانشورانِ ادب کے ذکر کے بغیر قومی سطح پر اردو کا ذکر نامکمل سمجھا جاتا تھا تو نو واردانِ ادب میں پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر لطف الرحمٰن، قمر اعظم ہاشمی، علیم اللہ حالی، ظفر اوگانوی، شبیر احمد وغیرہم نے اردو کے پرچم کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ان

لوگوں کے سینئر میں نامور صحافی جناب غلام سرور بانی روزنامہ ''سنگم''، پرفیسر وہاب اشرفی اور جونیروں میں پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر اسلم آزاد بھی اپنے اپنے شعبے میں نمایاں تھے۔ان تمام حضرات کی شروعاتی زندگی بڑے ہی جدوجہد کی رہی اور ان لوگوں نے علامہ اقبال کے اس مصرعہ ''یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم'' کے علمبردار بن کر یہ ثابت کردیا کہ انسان اگر صدق دل سے محنت ومشقت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کبھی مایوس نہیں کرتا۔ بلاشبہ مذکورہ لوگوں نے اپنے اپنے عملی شعبے میں اپنی نہ صرف پہچان بنائی بلکہ دوسروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ پروفیسر عبدالمغنی تو ان سب میں عمر کے لحاظ سے بڑے تھے اور ۱۹۶۰ء میں ملازمت میں آچکے تھے وہ بہ حیثیت انگریزی لکچرار بی این کالج میں درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے تھے لیکن پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر علیم اللہ حالی اور شبیر احمد بہ حیثیت طالبِ علم پٹنہ یونیورسٹی کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔اساتذہ میں پروفیسر اختر اورینوی کی حیثیت ملک گیر سطح پر ایک شمع کی تھی اور ان کے اردگرد ہر وقت ادب کے پروانے ان پر خود کو نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے اردو کے دانشوروں کا مرکز بھی اختر اورینوی کا دولت کدہ ہی ہوا کرتا تھا اور لطف الرحمٰن وقمر اعظم ہاشمی اس محفل کے چشم دید گواہ ہوا کرتے تھے۔اسی زمانے میں ''ساغرِ نو'' کا اجراء ہوااور اس کا تاریخی شمارہ اختر اورینوی نمبر قمر اعظم ہاشمی صاحب کی ادارت میں شائع ہوا جسے پوری اردو دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور قمر اعظم ہاشمی ولطف الرحمٰن کی صحافتی ٹیلنٹ کا ادبی دنیا نے لوہا مانا۔واضح ہو کہ انہی دنوں قمر اعظم ہاشمی روزنامہ قومی تنظیم سے بھی وابستہ تھے اور اپنی صحافتی لیاقت کی وجہ سے بھی اپنی پہچان مستحکم بنا چکے تھے۔جب غلام سرور صاحب نے روزنامہ ''سنگم'' جاری کیا تو پروفیسر قمر اعظم ہاشمی برسوں اس سے وابستہ رہے۔بہار میں اردو تحریک کے حوالے

سے بھی ان کی شخصیت منفرد مقام رکھتی ہے کہ انہوں نے انجمن ترقی اردو بہار کے قیام کے بعد پروفیسر عبدالمغنی کے شانہ بشانہ چلتے رہے۔ بالخصوص ریاست بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لئے جو تحریک شروع ہوئی اس میں پروفیسر ہاشمی پیش پیش رہے۔

اس تمہید کا مقصد صرف یہ ہے کہ قمر اعظم ہاشمی اپنی طالبِ علمی کے زمانے سے ہی اپنی فعال شخصیت اور علمی لیاقت کی بنیاد پر جہانِ ادب کو اپنی قد آوری کا احساس کراتے رہے۔ اب جب کہ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی ہمارے درمیان نہیں رہے کہ مورخہ ۶/اپریل ۲۰۱۲ء ان کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تو اب ممکن ہے کہ اردو آبادی ان کی لسانی وادبی خدمات پر مزید اظہارِ خیال کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں زندگی میں ہی دنیائے ادب نے جو مقام عطا کیا تھا وہ ان کے ہم عصروں میں بہت کم کو نصیب ہوا۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ کہ ستمبر ۲۰۰۵ء میں عابدہ ہائی اسکول، مظفر پور میں جشنِ قمر اعظم ہاشمی منایا گیا تھا۔ اس خاکسار کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے شامل نہیں ہوسکا جس کا مجھے افسوس رہا۔ پروفیسر ہاشمی سے میں تین دہائیوں سے واقف تھا۔ اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں ان کی کتابیں میرے زیرِ مطالعہ رہیں اور ان کے نصابی مضامین سے استفادہ کرتا رہا۔ جب ۱۹۹۶ء میں ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی کی تقرری بحیثیت لکچرار ہوئی تو ارشد سے میرے مراسم گہرے ہوئے۔ جب میں ملّت کالج میں آیا تو معلوم ہوا کہ جناب قمر اعظم ہاشمی، لطف الرحمٰن اور پروفیسر عبدالمنان طرزی صاحبان جیسی ادب کی نامور شخصیات اس کالج کے پہلے بیچ کے طالبِ علم رہے ہیں۔ یہ جان کر نہ صرف مسرت ہوئی بلکہ فخر کا احساس بھی ہوا کہ عہدِ حاضر کی ان قد آور ادبی شخصیتوں کی مادرِ علمی یہ کالج رہا ہے۔ چوں کہ قمر اعظم ہاشمی کا تعلق دربھنگہ سے رہا ہے اور ان کے تمام

خویش واقارب دربھنگہ میں ہیں اس لئے خاص موقعوں پر وہ دربھنگہ بھی تشریف لاتے تھے اور اپنی سسرال رسولپور، اسلام نگر میں قیام پذیر ہوتے تھے۔ وہاں بھی ایک دوبار ان سے روبرو ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان سے ملنے کے بعد یہ احساس ہوتا تھا کہ واقعی ایک روشنی پھوٹ رہی ہے اور ذہن کو منور کر رہی ہے۔ نہ کسی سے کوئی گلہ وشکوہ، بس تغیرِ زمانہ کی باتیں اور ادبی رجحانات کی سمت ورفتار پر فکر مندی۔ جب کہ میرا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ بیشتر اردو والے اپنی گفتگو کو اپنی ثناء خوانی اور غیروں کی ہجوگوئی تک محدود رکھتے ہیں لیکن قمر اعظم ہاشمی سے جب بھی کبھی ملاقات ہوئی تو بس یہ احساس ہوا کہ شرافت کا دوسرا نام قمر اعظم ہاشمی ہے۔ قمر اعظم ہاشمی کی تاریخِ پیدائش ۲۰ ر نومبر ۱۹۴۲ء ہے اس لحاظ سے مرحوم ۳۰ ر نومبر ۲۰۰۲ء کو ایل ایس کالج، مظفر پور سے بحیثیت یونیورسٹی پروفیسر سبکدوش ہوئے اور آخری سانس تک مظفر پور میں ہی رہے بلکہ ان کی آخری آرام گاہ بھی مظفر پور کی مٹی ہی طئے پائی۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے والد کا نام ڈاکٹر اعظم ہاشمی تھا۔ ان کا آبائی مکان ٹکولی، رونی سید پور، ضلع مظفر پور تھا لیکن ان کے والدِ مرحوم نے مہدولی، دربھنگہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن بعد میں قمر اعظم ہاشمی نے اپنی سسرال اسلام نگر، رسولپور میں ہی اپنا مکان بنا لیا تھا۔ ان کے سوانحی خاکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مقامی شفیع مسلم ہائی اسکول لہیر یا سرائے دربھنگہ سے ۱۹۵۷ء میں میٹرک پاس کیا تھا اور ملّت کالج دربھنگہ سے ۱۹۵۹ء میں آئی اے اور ۱۹۶۱ء میں بی اے اردو آنرز کا امتحان پاس کر کے پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ سے ۱۹۶۳ء میں ایم اے (اردو) ۱۹۶۷ء میں ایم اے (فارسی) کی ڈگری حاصل کی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ہی انہوں نے ۱۹۷۱ء میں پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایل ایس کالج، مظفر پور سے کیا جہاں وہ جنوری ۱۹۷۰ء میں بحیثیت لکچرار بحال ہوئے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں

ریڈراور ۱۹۸۶ء میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنے پڑھنے کے معاملے میں سنجیدہ تھے اور بحیثیت استاد بھی انہوں نے اپنی لسانی وادبی سرگرمیوں کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زیرِ نگرانی 60 سے زیادہ ریسرچ اسکالروں نے اپنا تحقیقی مقالہ برائے امتحانیہ مکمل کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تو درجنوں بین الاقوامی وقومی سمیناروں میں ان کے علمی مقالے موضوعِ بحث رہے۔ان کی ایک درجن تالیفات وتصانیف اردو زبان وادب کے سنجیدہ حلقے میں ریفرنس بک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان میں ''فکروفن'' (۱۹۶۳ء)، ''نقش ہائے رنگ رنگ'' (۱۹۷۱ء)، ''اردو میں ڈرامہ نگاری'' (۱۹۷۵ء)، ''بہار کے نظم نگار شعراء'' (۱۹۸۸ء) ''نصاب'' (۱۹۸۳ء)، ''عصری ادب کا شعور'' (۱۹۸۳ء)، ''نیا نصاب'' (۱۹۸۴ء)، ''ضحاک۔ ایک تنقیدی مطالعہ'' (۱۹۸۴ء)، ''اشعارِ اکبر'' (۱۹۸۵ء)، ''مثنوی سحرالبیان'' (۱۹۸۵ء)، ''واردات'' (۱۹۹۱ء)، ''ادبیات'' (۱۹۹۱ء) ، ''انتخابِ ذوق'' (۱۹۹۲ء)، ''مضامین'' (۱۹۹۴ء) اور ''ساغرِ نو'' اختر اورینوی نمبر (۱۹۶۵ء)، ''عرب امارات کا سفری دورانیہ'' (سفر نامہ ۲۰۱۰ء)، ''سرسری اس جہانِ سے گزرے'' (خودنوشت ۲۰۱۰ء) قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ ان کے دو درجن ادبی مضامین کو ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی نے ''ادبی تقویمات'' کے نام سے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا جس میں ''عصری ادب کا شعور''، ''موضوع کی تلاش میں''، ''معیاری ادبی نثر''، ''رومانیت اور ادب''، ''ادب اور شعور''، ''نیا ادب اور ذات کی تلاش''، ''اقبال کی نظموں کا تکنیکی سلیقہ''، ''تہذیبِ حاضر پر اقبال کی تنقید''، ''جمیل مظہری اور تصورِ خدا''، ''فیض اور راشد''، ''پرویز شاہدی کی نظم نگاری''، ''فراق کی شاعری میں احساس کی توانائی''، ''نظم اور عصری نظم نگاری''، ''تنقید کی تخلیقی حیثیت''، ''افسانے کی عصری حسیّت''، ''منٹو کا فن'' اور ''پروفیسر احتشام حسین کا

اسلوبِ تنقید'' جیسے بیش قیمتی تنقیدی مقالات شامل ہیں۔یہاں ان کے تنقیدی مقالہ ''ادب اور شعور'' کا ایک اقتباس نمونتاً پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس اقتباس سے پروفیسر قمراعظم ہاشمی کے طرزِ تحریر کا بھی پتہ چلتا ہے اور شعورِ نقد کا بھی:

''قیمتی اور نادر تجربات، لطیف ترین احساسات، عمیق ترین جذبات اور بلند ترین تخیل وافکار کے ذریعۂ اظہار کو ادب کہتے ہیں۔ ادب زندگی کا جز ولطیف ہے جس میں جمال کی حسن آرائیوں کے ساتھ جلال کی عظمتیں بھی پوشیدہ ہیں اور شعلے کی طرح اس میں چمک دمک کے ساتھ تپش وحرارت بھی ہے۔ادب التباس حواس کا نام نہیں، بلکہ یہ شعور کی پوری قوت سے وقت کے تقاضے کو پورا کرتا ہے۔زندگی کی بے راہ رویوں، خامکاریوں اور کجرویوں کو اجاگر کرتا ہے۔ادب میں اس لحاظ سے سرتا سر ارضیت ہوتی ہے لیکن اس خارجیت کے ساتھ داخلیت کے اہم عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں اور ان سب کا انحصار شعور پر ہے۔ادیب کا شعور جتنا بالغ ہوتا ادب اتنا ہی ارفع واعلیٰ ہوگا۔نفسیاتی اعتبار سے ذہن یا دماغ کے تین طبقات معین کئے گئے ہیں۔طبقہ اور تو تشکیل پذیر شعور کا ہے جو بہت جلد تھک جاتا ہے۔یہ شعور بیداری اور تدبیر علم ہے۔یہ ارتقاء پسند ہوتا ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے تمام کام کی اہمیتیں اور مختلف تدابیر سوچا کرتے ہیں۔یہی شعور ایجاد واختراع اور علمی بحث وتنقید میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعہ ہم تنقید اور مجادلہ ومناظرہ کرتے ہیں۔شعور ہی ہے جو ہمارے مذہبی اور سیاسی

عقائد کی حد بندی کرتا ہے اور انسانوں کے مزاجوں اور ان کے اخلاق و کردار کی تشکیل کرتا ہے اور ان کے ارتقا یا انحطاط پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شعور کی ان اہمیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بے خوف کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مطالعہ گویا تمام انسانی شخصیتوں اور سماج وقوم کا مطالعہ اور ادب بغیر ان مطالعوں کے بس تفریحِ طبع ہی کا ذریعہ ہوگا۔ جس پر افلاطونی حکم صادر کرنا بالکل حق بجانب ہوگا۔ شعور ثقافت جدید کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس پر عصرِ نو کی مکمل اور گہری چھاپ ہوتی ہے۔ یہ احساس وادراک اور برہان و تجربہ کی عقل ہے۔ ادیب اسی قوت شعور کے ذریعہ جذبات واحساسات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کر کے ان کو بلند و برتر کرتا ہے۔ خود بھی بلند و برتر ہوتا ہے اور ہمیں بھی اپنی سطح ارفع تک لے جاتا ہے، جس کے لئے مکمل آزادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ادب کو بھی اتنا واضح ہونا چاہئے کہ ادیب جس موضوع کو چاہے اسے اس شکل میں پیش کر سکے۔ کیوں کہ اس کا اہم کام عواطف واحساسات کو بلند و برتر شکل میں پیش کرنا، قارئین کو بامِ ارتقا تک لے جانا اور ان کے میلانات وخواہشات کو اپنی ظاہری سطح سے ترقی یافتہ صورت میں استعمال کرنا ہی ہے۔''

(ادبی تقویمات۔ ص:۷۹۔۸۰)

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی حیات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے تمام عمر زبان وادب کے پودوں کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کیا۔

عنوان کے تقاضوں کو پورا کروں اور آپ اہلِ فکر ونظر کو یقین دلاؤں کہ راقم الحروف نے سرسید احمد جیسی بحرِ ذخار شخصیت کا صرف ساحل سے نظارہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان کی فکر ونظر کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہوکر گوہرِ آبدار حاصل کرنے کی سعیِ پیہم بھی کی ہے۔ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوسکا ہوں اس کا فیصلہ تو آپ اہلِ فکر و نظر حضرات ہی کریں گے۔

عہدِ حاضر جسے عہدِ عالمیت (گلوبلائزیشن) قرار دیا گیا ہے اور جس میں پوری دنیا ایک بازار بن چکی ہے۔ انسان کی زندگی کے تصورات اور معنی بدل گئے ہیں۔ انسان کے افکار ونظریات کو بھی سائنسی جدید دریافتوں کے میزان پر پرکھا جارہا ہے۔ ہر وہ شئے جو آج ہماری ضروریات میں شامل ہے وہ نئی صبح کے ساتھ بیکار ثابت ہورہی ہے کیوں کہ کل کوئی نئی دریافت یا ایجاد اس کو بے معنی کرسکتی ہے۔ ایسے دورِ انقلاب میں یہ سوال بھی ذہن میں بارہا اٹھتا ہے کہ کیا ۲۱/ویں صدی جو سائنس و ٹکنالوجی کی صدی ہے اس میں ہمارے سماجی، مذہبی، تعلیمی اور سیاسی دانشور ومفکر کے افکار ونظریات کی اہمیت ومعنویت کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا تو خیال یہ ہے کہ آج کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے حالات میں ان کے افکار ونظریات بے معنی ہو چکے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ دورِ حاضر میں ہمارے سامنے جو مسائل کھڑے ہیں اس کا مقابلہ ہم اٹھارہویں یا انیسویں صدی کے مصلح ومفکر کے اصولِ زیست سے نہیں کرسکتے۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے کہ آج بھی ہمارے ان مصلح ومفکر کے فکری سرمائے ہمارے لئے اتنے ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنے ان کے عہد میں تھے۔ جہاں تک سرسید احمد خاں کے فکری اثاثے کی معنویت کا سوال ہے تو ان کو ہم کسی خاص عہد سے منسوب نہیں کرسکتے۔ سرسید احمد افقِ انیسویں صدی کے وہ تابناک ستارہ ہیں جس کی تابناکی میں علم وحکمت، شعور وآگہی، بصیرت وبصارت اور دوراندیشی اور دانشوری

تحقیق وتنقید ان کا خاص میدان رہا، درس وتدریس کے پیشے سے وابستگی نے انہیں یہ موقع فراہم کیا کہ ان کا رشتہ ہمیشہ کتابوں سے رہا۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور زبان وادب کے تئیں صحت مند فکر کے حامل تھے جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں گہرائی اور گیرائی نظر آتی ہے۔ ان کی تنقیدی آراء بھی نپی تلی ہوتی تھی۔ ان کی تحریر میں کہیں بھی ابہام نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''ان کی تحریروں میں ایک باشعور محقق اور دیدہ ور نقاد کی پہچان ہوتی ہے۔ ان کے بہت سے قیمتی مقالے ہندوستان کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ آج بھی خوب لکھ رہے ہیں''۔

قمر اعظم ہاشمی نے ایک بار خود ہی ایک مضمون میں اپنے تصورِ بشر اور نظریۂ نقد وادب کی وضاحت یوں کی تھی:

> ''میں کسی نقطۂ نظر کی فارمولائی تحدید و پابندی کو غیر مستحسن تصور کرتا ہوں۔ میرے نزدیک ان اقدار انسانیت کی پاسداری ہی کافی ہے جن سے زندگی کے مثبت، صالح اور تعمیری تصورات نشو ونما پاتے ہیں۔ ایسا ادبی نظریہ جو پارٹی پروگرام کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہو اور کسی نہ کسی اعتبار سے عظیم طاقتوں سے وفادارانہ الحاق سے متعلق سازشوں کی پرورش کر رہا ہو میرے لئے ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہے۔ انسانیت سوزی کے خوفناک اور خونی ڈرامے کابل میں ہوں یا بیروت میں، تہران میں ہوں یا تبت میں سب یکساں طور پر نفرت و مذمت کے لائق ہیں۔''

پھر آگے لکھتے ہیں:

''میرے سامنے یہ حقیقت ہمیشہ رہی ہے کہ اخلاقی رابطوں اور ضابطوں کو نظر انداز کر کے فن وادب کی نہ تخلیقی روایت کا معقول فروغ ممکن ہے اور نہ ہی تنقیدی روایات کا نقطۂ نظر، خواہ کوئی بھی اختیار کیا جائے فن وادب کو عصری اور سماجی زندگی کے حوالے سے ہی سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے''۔

بلاشبہ ان کی تنقیدی تخلیقات کے مطالعہ سے یہ عقدہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کے ساتھ انصاف کیا اور اپنے وسعتِ مطالعے کی مہر ثبت کی۔ موضوع کے تنوع میں سلیقگی بھی برقرار رکھی اور اعتدال پسندی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ادبی معاملات میں کسی بھی طرح کے ذہنی تعصّبات وتحفظات کو پیشِ نظر نہیں رکھا بلکہ سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنے کو ایمان جانا۔ نہ کبھی کسی صلے کی پرواہ کی اور نہ کسی سے کوئی شکوہ وگلہ رکھا۔ اگر چہ جہانِ ادب کے سنجیدہ قارئین نے ہمیشہ ان کی تخلیقات کی قدر کی اور یہی داد وتحسین ان کے لئے سرمایۂ عظیم رہا۔ لیکن بہار اردو اکیڈمی کے علاوہ کئی دوسری ریاستوں کی اکادمیوں نے بھی ان کی تصانیف کو قابلِ انعام قرار دیا اور انہیں اعزاز بخشا۔ محکمہ راج بھاشا حکومت بہار کی جانب سے بھی انہیں ادبی اعزاز سے نوازا گیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ وہ ہمیشہ علمی وادبی کاموں کے تئیں مخلص رہے اس لئے کسی انعام کا ملنا اور نہ ملنا ان کے لئے کبھی بھی باعثِ غور وفکر نہیں رہا اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کسی خاص ادبی گروہ میں شامل بھی نہیں رہے بلکہ خود اپنی علمی وادبی صلاحیت اور تحقیقی وتنقیدی بصیرت و بصارت کی بنیاد پر جہانِ ادب میں محور ومرکز کی حیثیت سے قائم رہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے بجا ہی کہا ہے کہ:

''ان کی ادبی شخصیت ایک مفکر کی بصیرت اور ایک شاعر کی

داخلیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ وہ حق العباد اور احترامِ بشر
کی شاندار روایتوں کے امین ہیں''۔

ان کے انتقال پر نہ صرف ادبی حلقہ سوگوار ہے بلکہ مختلف شعبۂ حیات کے لوگوں نے بھی پروفیسر ہاشمی کی ہمہ جہت شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں خراجِ عقید پیش کیا ہے۔ بالخصوص ریاستِ بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے ان کے انتقال کو بہار کے لئے خسارۂ عظیم قرار دیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب کے علاوہ سماجی سروکار کی دنیا میں بھی اپنا اہم مقام رکھتے تھے۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے غالبؔ نے کہا تھا ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

☆☆☆

پروفیسر لطف الرحمٰن کا نظریۂ شعروادب

عالمی تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ بیسویں صدی ایک طرف ہولناکیوں، تباہیوں اور انسانی رشتوں کے شکست وریخت کی صدی رہی ہے کہ اس میں دو عالمی جنگیں اور نیوکلیائی وکیمیائی ہتھیاروں کی ایجادات نے انسانیت کو خسارۂ عظیم پہنچایا ہے۔ وہیں دوسری طرف یہ صدی صنعتی انقلابات اور منجملہ شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے قابلِ تحسین کارناموں کی بھی صدی رہی ہے۔ اس لئے اس صدی کو نشاۃ ثانیہ کی صدی بھی کہی جاتی ہے۔ جہاں تک زبان وادب کا سوال ہے تو اس شعبے میں بھی بیسویں صدی ایک زرخیز صدی مانی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس صدی میں آسمانِ عالمی ادب پر سینکڑوں درخشاں ستارے نمودار ہوئے ہیں۔ اردو کے تعلق سے بھی بیسویں صدی ایک غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق، جدیدیت، تعمیریت اور مابعد جدیدیت کے پودوں کی آبیاری بھی اسی صدی میں ہوئی اور اسے تناوری بھی حاصل ہوئی۔ لطف الرحمٰن جیسی ہمہ جہت شخصیت کا تعلق بھی علم وفن کی اسی زرخیز صدی سے ہے کہ ان کی پیدائش ۲رفروری ۱۹۴۱ء کو شمالی بہار کے مردم خیز خطہ دربھنگہ کے ریونڈھا گاؤں میں ہوئی تھی اور ان کا انتقال ۳۱راگست ۲۰۱۳ء کو بھاگلپور میں ہوا۔ غرض کہ نصف بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے تمام نشیب وفراز کے مناظر وطلاطم ان کے ذہن وفکر کے محور ومرکز رہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ عقدہ اجاگر ہوتا ہے کہ وہ ادب،

سماج اور زندگی کے جمالیاتی رشتوں کے امین تھے۔انہوں نے نہ صرف اردو شاعری کو تازگیٔ برگِ نوا سے نوازا بلکہ فنونِ لطیفہ اور تخلیقی تخیل کو بھی اپنی تنقیدی بصیرت وبصارت سے نئی سمت ورفتار بخشی۔اس طرح کی ہمہ جہت شخصیت کا انتقال نہ صرف اردو زبان وادب کے لئے بلکہ ہندوستانی ادب کے لئے خسارۂ عظیم ہے۔

لطف الرحمٰن کی حالاتِ زندگی پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی ذہین وفطین تھے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں بے پناہ ذہانت وصلاحیت سے نوازا تھا۔انہوں نے دربھنگہ کے تاریخی شفیع مسلم ہائی اسکول سے ۱۹۵۷ء میں امتیازی نمبر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ان کے اساتذہ اور ہم درجہ آج بھی ان کی ذہانت کی مثال پیش کرتے ہیں۔وہ پھر پٹنہ گئے اور بی۔این کالج سے انٹر پاس کیا لیکن دربھنگہ جو زمانۂ قدیم سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے اس کی یادیں انہیں پھر دربھنگہ کھینچ لائی۔یہاں انہوں نے شہر کے تاریخی تعلیمی ادارہ ملّت کالج ،دربھنگہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۱ء میں بی۔اے آنرز کے امتحان میں بہار یونیورسٹی میں اول درجہ حاصل کر گولڈ میڈلسٹ ہوئے۔چوں کہ اُس وقت دربھنگہ میں اردو وفارسی میں ایم۔اے کی پڑھائی کا نظم نہیں تھا اس لئے انہیں پھر پٹنہ جانا پڑا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور وہاں سے انہوں نے پہلے ایم۔اے(اردو) کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں ٹاپ رہے۔پھر ایم۔اے(فارسی) کے امتحان میں شامل ہوئے اور یونیورسٹی میں ٹاپ کر گولڈ میڈل حاصل کیا۔واضح ہو کہ اردو میں بھی انہیں گولڈ میڈل ملا تھا اور برسوں تک اس کی گونج حلقۂ ادب میں رہی۔انہوں نے اپنے استادِ محترم پروفیسر اختر اورینوی اور علامہ جمیل مظہری کے مشورے پر ۱۹۶۶ء میں ٹی۔این۔بی کالج بھاگلپور میں بہ حیثیت لکچرار (اردو) جوائن کیا۔بعدہٗ بھاگلپور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے اور فروری ۲۰۰۱ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔

پروفیسر لطف الرحمٰن کی شخصیت ہمہ جہت تھی وہ ایک طرف زبان وادب کے اچھے استاد تھے تو دوسری طرف سماجی وسیاسی میدان میں بھی اپنی مستحکم شناخت رکھتے تھے۔ان کی سیاسی بصیرت اور سماجی شعور کے قائل ریاست بہار کی تمام سیاسی پارٹیوں کے سربراہ تھے۔انہیں کئی سیاسی پارٹیوں نے سیاست میں عملی طور پر شامل ہونے کی دعوت دی لیکن شروع کے دنوں میں انہوں نے خود کو زبان وادب تک ہی محدود رکھا لیکن ۱۹۹۵ء میں راشٹریہ جنتادل کے سربراہ لالو یادو کی ایماء پر وہ عملی سیاست میں داخل ہوئے اور بھاگلپور کے ناتھ نگر اسمبلی حلقہ سے ممبر قانون ساز اسمبلی منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۷ء سے ۱۹۹۹ء تک وہ بہار کی کابینہ میں بھی شامل رہے۔انہیں محکمۂ اقلیتی فلاح و بہبود اور محکمہ تعمیر سڑک کی وزارت دی گئی اور یہاں بھی انہوں نے اپنی ذہانت اور سیاسی بصیرت کا ثبوت پیش کیا اور بے داغ رہے۔سیاست میں مصلحت پسندی ایمان کا درجہ رکھتی ہے لیکن لطف الرحمٰن نے کبھی بھی حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑا۔نتیجتاً وہ جلد ہی سیاست کی مصلحت پسند دنیا سے باہر نکل آئے اور بقول پروفیسر قمر رئیس ''سیاسی لکڑبگھوں کی چنگل سے نکل آئے''۔

یوں تو لطف الرحمٰن اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنے پڑھنے کی طرف مائل تھے لیکن پیشۂ تدریس میں آنے کے بعد انہوں نے ادب کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔شروع کے دنوں میں چھپنے چھپانے میں دلچسپی رہی لیکن بعد کے دنوں میں اپنی تحریروں کو شائع کرانے سے زیادہ مطالعے میں غرق رہے۔جن لوگوں نے لطف الرحمٰن کی تحریریں پڑھی ہیں یا تقریریں سنی ہیں وہ خود ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ لطف الرحمٰن کا مطالعہ کتنا وسیع تھا اور ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کی گیرائی وگہرائی کیا تھی۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہی کیا تھا۔ان کی پہلی شعری تخلیق بہ صورتِ نظم انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ''ہماری زبان'' ۱۹۶۱ء میں شائع

ہوئی تھی جس کے ایڈیٹر اردو ادب کے قد آور ناقد پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تازگی برگِ نوا'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا اپنی غزلیہ شاعری کے متعلق خود انہوں نے لکھا ہے کہ:

''میری غزلیں میری باطنی خود کلامی کی صدائے باز گشت اور میرے تلخ و شیریں تجربات کی پردۂ سخن ہیں۔میں نے اس صدی میں اپنی آواز کی تہذیب و تحسین کا بارِ گراں اٹھایا جو کامیو کے لفظوں میں مکروہ ترین انسانی جرائم کے ارتکاب کی صدی ہے، بیسویں صدی کے تقریباً وسط میں ہیروشیما اور ناگاسا کی پر ایٹم بم کے بے ضمیر حملوں نے بے گناہ انسانوں کے قتل عام کا جشن جس انداز میں منایا اور جس طرح دوسری جنگِ عظیم میں تقریباً پانچ کروڑ انسان موت کے گھاٹ اتار دئے گئے وہ میرے لاشعور کی تشکیل کا عہد تھا، جس نے مجھے اس اجتماعی لاشعور کا حصہ بنایا، جس کا سنگ بنیاد تشدد اور ہمہ گیر انتشار ہے، اس کے بعد سے دنیا میں تشدد، انتشار، بے انصافی اور انسانی جرائم کے جوڈرامے مسلسل کھیلے جا رہے ہیں انہوں نے میرے باطن کو مسلسل عذاب میں رکھا ہے، اس لئے میری غزلوں میں دکھ اور انتشار کا احساس زیادہ نمایاں اور گہرا ہے'' (بوسۂ نم۔ص:۱۱)

لیکن جب ''تازگی برگِ نوا'' کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا تو انہوں نے اپنے نظریۂ شعر میں تبدیلی کی وضاحت یوں کی:

''میں عالمگیریت کی اس ہولناک سیاسی، تہذیبی، اقتصادی اور علمی وادبی جارحیت کے عہد میں صرف غزل گوئی سے مطمئن

نہیں ہوں۔ ہمارے ارد گرد کی دنیا ہزاروں مسائل کی آماجگاہ ہے۔ یہ بے ضمیری کا عہد ہے۔ اجتماعی قتل انسانی کا دور ہے۔ بے کرداری موجودہ اجتماعی زندگی کی پہچان ہے۔ ان سارے مسائل کی ادبی تعبیر وتفسیر غزل کے ذریعہ ممکن تو ہے لیکن تہ در تہ رمزیت وایمائیت کی متقاضی ہے''۔

(بحوالہ: تازگی برگِ نوا۔ ایڈیشن دوئم ۲۰۱۱ء۔ ص: مقدمہ، ل)

اور فکری اظہار کے لئے نثری نظم کی وکالت شروع کی۔ ان کا مجموعہ ''راگ براگ'' اس کا ثبوت ہے:

''نثری نظم عصرِ حاضر کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور جدلیاتی قدروں کے منفی ومثبت احساسات کی آئینہ داری کرتی ہے جن میں انسان اقتصادی برتری و بالا دستی کے جنون اور جنسی Perversion کے دائروں میں اس طرح اسیر ہوگیا ہے کہ زندگی کی عصری اور حقیقی سطح پر جینے کے تصور سے بھی بے تعلق ہے۔ اس عہد کی معاشرتی بے چارگی، مذہبی تشدد اور جنسی جنون نے پورے انسانی معاشرے کو شکست وریخت کا مرکز بنا دیا ہے''۔

(راگ براگ، ۲۰۱۲ء: ص: ۱۶)

دراصل لطف الرحمٰن عصری حسیت کے نبض شناس تھے اور ان کی نگاہوں میں صرف درسی ونصابی کتابیں نہیں تھیں جیسا کہ ان دنوں ہمارے مبینہ دانشوروں کی میزانِ عقل کا محور ومرکز ہے۔ بلکہ وہ ادب کے علاوہ تواریخ، سماجیات، سیاسیات اور نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ان کی تخلیقات اس حقیقت کو عیاں کرتی ہیں کہ

انہوں نے اپنی تحریروں میں علوم وفنون کے کتنے چراغوں سے استفادہ کیا ہے اور اپنی فکر ونظر کی دنیا روشن کی ہے۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ:

''تخلیق فن عبادت ہے۔ تفریح طبع کی چیز نہیں، شعر وسخن بھی تزکیۂ نفس کا ایک پر اثر اور دلکش وسیلہ ہے۔ اس سے روحانی بصیرت، زندگی میں نفاست، معصومیت اور تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ جمالیاتی ادراک کی منزلوں میں ذات سے فطری بے نیازی رفعتِ احساس عطا کرتی ہے جو بے ثبات زندگی کی آلائشوں اور کثافتوں سے نجات کا خوبصورت وسیلہ بن جاتی ہے۔ شاعری روحانی نابصیری کا بہترین مداوا اور ابدیت سے ہم آہنگی کا بہترین ذریعہ ہے۔ عمومی سطح زندگی سے بے تعلقی، روحانی رفعت اور باطنی پاکیزگی پر مبنی فن کارانہ تخلیق تزکیۂ باطن کی رہگذر میں انمول رختِ سفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ فن کا مقصد داخلی معراج ہے''۔ (مقدمہ۔ ''بوسۂ نم''۔ ۲۰۰۷ء ص: ۷)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے فن کو ہمیشہ عبادت کا درجہ دیا ہے، لیکن حضوری ہر عارف کا مقدر نہیں، مگر حسن کے جلوہ ہائے گریزاں جگنو کی طرح سالک کی آنکھوں کے افق پر آنکھ مچولی کرتے رہتے ہیں۔ یہی جلتی بجھتی دھیمی روشنی جب غزلوں کے اشعار میں ڈھلتی ہے تو روح کی گہرائیوں میں سلگتے ہوئے شعلے قطرۂ شبنم بن کر سینے پر ٹپکنے لگتے ہیں اور جب باطن اس شبنمی برسات سے لبریز ہو جاتا ہے تو صبر وضبط کے ہر بند کو توڑ کر یہ سیلاب آنکھوں سے

ابل پڑتا ہے۔(بوسۂ نم۔ص:۱۲)

پروفیسر لطف الرحمٰن کی شعری کائنات پانچ مجموعہائے کلام پر مشتمل ہے۔''تازگیٔ برگِ نوا(۱۹۷۷ء)''بوسۂ نم''(۲۰۰۷ء)، ''صنم آشنا'' (۲۰۰۸ء) ''دشت میں خیمہ گل''(۲۰۱۲ء)،''راگ براگ''(۲۰۱۲ء)۔ان مجموعوں کی غزلوں، نظموں اور نثری نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ لطف الرحمٰن ایک فطری شاعر تھے اور ان کی فکر ونظر کا محور فلاح و بہبودِ انسانیت تھا۔اس لئے وہ شروع کی روایتی شاعری یعنی گل ورخسار کی دنیا سے جلد ہی باہر نکل کر مسائلِ زیست کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔''تازگیٔ برگِ نوا'' کی چند غزلوں کو چھوڑ دیں تو یہ پہلا مجموعہ ہی یہ حقیقت بیاں کرتا ہے کہ لطف الرحمٰن کے اندر کا دکھ صرف شاعر کا دکھ نہیں ہے بلکہ یہ غمِ ذات تو غمِ جہاں کا درجہ رکھتا ہے ؎

صدائے سبز نے مجھ کو بے کنار کیا
خود اپنی ذات میں سمٹا ہوا جہاں تھا میں
اٹھائے دوش پہ صدیوں کی بے حسی کا بوجھ
گذشتہ شب کوئی کھینچی ہوئی کمان تھا میں

☆

دلکشی اب بھی عمارت کی بظاہر ہے وہی
گرچہ اندر سے بکھرتی ہوئی دیوار ہوں میں

☆

بدلا ہے ساتھ ساتھ مرے آسماں کا رنگ
ٹھہرا ہے اک مقام پہ یہ کارواں بھی کب

''دشت میں خیمۂ گل''، ''بوسۂ نم''، ''صنم آشنا'' اور ''راگ براگ'' کی شاعری لطف